بھی عمدہ مذاق رکھتے ہیں، ان کو کئی زبانوں سے واقفیت ہے، ہندی اور انگریزی میں مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں، زیر نظر کتاب ان کی دلچسپ ہندی تصنیف "دلی میں دس ورش" کا اردو ترجمہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۵۸ء میں اور دوسرا ترمیم و اضافہ کے بعد ۶۷ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ۴۷ء سے ۵۷ء تک کی دلی کی معاشی معاشرتی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی و ادبی زندگی کا خاکہ اور مختلف طبقوں کے مزاج و خصوصیات کی تصویر کشی کی گئی ہے، دلی عروج و زوال کے مختلف دوروں سے گذری ہے، لیکن ان دس سالوں میں اس کو جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا وہ نہایت سنگین تھے، گذشتہ جنگ عظیم کی ہولناکی ۴۲ء سے لیکر آزادی تک کے مختلف مراحل اور ان سے متعلق واقعات و حوادث ملک کی تقسیم، مسلم کش فسادات، گاندھی جی کا وحشیانہ قتل، دلی میں پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کی آبادکاری اور مسلمانوں سے اس کا تخلیہ وغیرہ کا مرقع نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے، مصنف طبعاً ظریف اور خوش طبع ہیں، اس لیے ان حوادث میں بھی ظرافت کی آمیزش ہے، ان کو قومی و ملکی مسائل سے بھی گہری دلچسپی ہے چنانچہ وہ زبان اور قومی یکجہتی وغیرہ کے مسائل پر اپنے خیالات اخباروں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں، اس مجموعہ میں بھی اس قسم کے چند مضامین ہیں، گو ان کے تمام خیالات خاص طور سے مسلمانوں کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ان سے پورا اتفاق نہیں کیا جاسکتا لیکن مصنف کی نیک نیتی اور خلوص میں شبہہ نہیں، انھوں نے اس کتاب میں جن دس سالوں کے دلی کا نقشہ پیش کیا ہے، اس سے انکے ذہن کی رسائی، نظر کی گہرائی، مشاہدہ کی قوت اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جناب سلیم احمد نے اس دلچسپ کتاب کا اتنا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۷ - ماہ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۱ء - عدد ۵

مضامین

شذرات

مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں، ہندوستان کے دستور نے بھی اس کا حق دیا ہے، اور کانگریس ورکنگ کمیٹی، ایجوکیشن کمیشن، وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن وغیرہ سب نے اسکی پوری حمایت کی ہے، چودہ قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے، چنانچہ ان زبانوں میں تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے حکومت نے جو خطیر رقم منظور کی ہے اس میں ایک کم ورا اردو کا بھی حصہ ہے، دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے اور جلد ہی اسکی یونیورسٹیاں بھی قائم ہو جائیں گی، اردو زبان میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا مسئلہ نیا نہیں ہے، برسوں سے چل رہا ہے، ریاست حیدرآباد نے تو ہندوستان کی آزادی سے مدتوں پہلے اردو کی یونیورسٹی قائم کر دی تھی جس میں سارے فنون کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی، مگر آزادی کے بعد حالات نے اردو کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دی کہ اردو میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا سوال الگ رہا، اسکو اسکے مرکز دکن سے نکال دیا گیا، جامعہ عثمانیہ بھی اسکی بھینٹ چڑھ گئی، مگر اردو کی مخالفت اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے، فرقہ پرور پارٹیوں کو چھوڑ کر ہر سطح پر اسکے حقوق کا اعتراف کیا جانے لگا ہے، اسلیے مادری زبان میں تعلیم کے فیصلہ کے بعد اردو یونیورسٹی کا مسئلہ پھر سامنے آگیا ہے،

اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو کسی ریاست کی علاقائی زبان نہیں مانا جاتا اور خوش قسمتی یہ ہے کہ پورا ہندوستان اسکا علاقہ ہے، اور وہ ہندی ریاستوں کے بڑے حصہ کی مادری زبان ہے، اسکے بولنے والوں کی تعداد کئی کروڑ ہے، علمی حیثیت سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، اور ہندوستان کے سیکولر کردار کی سب سے بڑی نشانی ہے، اسلیے ہر حیثیت سے یونیورسٹی کی مستحق ہے، اسلیے خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے اس مہم کو اٹھایا ہے، اور "اردو یونیورسٹی کی تجویز" کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں بڑی خوبی سے اسکی وکالت کی ہے اور اردو کی اہمیت اور اردو یونیورسٹی کی تجویز کو بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیا ہے، اس

تجویز سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، یہ تو اردو والوں کی دلی آرزو ہے، سوال جو کچھ ہے وہ اس راہ کی رکاوٹوں کا ہے، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ صوبائی حکومتیں ہیں، وہ زبانی تو اردو کے حقوق کا اعتراف کرتی ہیں اور کبھی کبھی اردو کی تعلیم کے متعلق کوئی سرکلر بھی جاری کر دیتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا اور اردو کا قدم جہاں تھا وہیں ہے، اس لیے جب تک اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام نہ ہو، یونیورسٹی کا قیام بے معنی ہے، اس میں پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے، اسلیے سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی رکاوٹیں دور کرنا ضروری ہے جو اردو والوں کے اختیار میں نہیں ہے، دوسری رکاوٹ خود اردو والوں کی غفلت اور لاپروائی ہے، حکومت نے اردو کو تعلیم سے خارج کر کے اتنا غیر اہم بنا دیا ہے کہ عملی زندگی میں اسکی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی ہے، اسلیے جنکی زبان اردو ہے وہ بھی اسکی تعلیم سے گریز کرتے ہیں، اسکا جواب خواجہ صاحب نے دیا ہے مگر وہ تشفی بخش نہیں ہے، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے جائیں اسکے بغیر یونیورسٹی کا تخیل کامیاب نہیں ہو سکتا جب بنیاد ہی غائب ہو گی تو عمارت کس پر تعمیر ہو گی

بھوپال کی تاج المساجد اپنی وسعت اور شکوہ و عظمت کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخی مسجدوں میں ہے، اس میں دلی کی جامع مسجد جیسا حسن و تناسب تو نہیں ہے لیکن اس سے زیادہ وسیع ہے، نواب شاہ جہاں بیگم نے اس کو تعمیر کرایا تھا مگر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ انکا انتقال ہو گیا، انکے بعد ان کے جانشینوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے مسجد کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ رفتہ رفتہ جھاڑیوں کا جنگل اور جانوروں کا بھٹ بن گئی اور برسوں اس حالت میں پڑی رہی، مسجد کی اصل عمارت تو مکمل ہے صرف مینار باقی ہیں، صحن کے تین طرف جو دالان ہیں، ان میں جنوبی اور مشرقی سمت کے دالان تو مکمل ہیں، شمالی سمت کا دالان اور صدر دروازہ نامکمل ہے، اور بنے ہوئے حصے بھی مرمت طلب ہو گئے تھے۔

برسوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کو مسجد کی تکمیل کی طرف متوجہ کر دیا، انھوں نے اس کی جھاڑیاں اور ملبہ صاف کرایا، اور جنوبی اور مشرقی سمت کے دالانوں کو

جن کے در کھلے ہوئے تھے، کمرہ کی شکل میں بدل کر ان میں عربی کا ایک دار العلوم قائم کر دیا، یہ کمرے اس قدر وسیع ہیں، اور اتنی تعداد میں ہیں کہ دار العلوم کے جملہ شعبوں کے لیے کافی ہیں، اور یہ دار العلوم کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے مسجد کی ناتمام عمارتوں کی تکمیل کا بھی بیڑا اٹھایا، اس میں لاکھوں روپئے کا صرف ہے، انھوں نے ہندوستان اور بیرون ہند سے اس کے لیے معتول سرمایہ بھی فراہم کر لیا، اور گذشتہ مہینہ ۲۲ اپریل کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس میں ہندوستان کے بہت سے مشاہیر مدعو تھے، افتتاح کی رسم سعودی عرب کے سفیر شیخ انس یوسف یاسین ادا کرنے والے تھے، لیکن عین موقع پر بعض ناگہانی حوادث کی وجہ سے خود نہیں جا سکے اور ان کے بجائے انکے نائب شیخ یوسف مطبقانی نے یہ رسم انجام دی۔

ایک زمانہ میں بھوپال دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا، مگر حالات کے انقلاب نے اس کی یہ حیثیت ختم کر دی تھی، اب دار العلوم کے بدولت پھر اس کے زندہ ہونے کی امید ہو گئی ہے، اگر مسلمان ہمت سے کام لیں تو دار العلوم تاج المساجد پورے صوبۂ متوسط کا اسلامی مرکز بن سکتا ہے، یہ بھوپال والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو مولانا محمد عمران خاں کے جیسا مخلص اور حوصلہ مند شخص مل گیا ہے، جس نے اپنی زندگی تاج المساجد اور اس کے دار العلوم کے لیے وقف کر دی ہے، ورنہ اس زمانہ میں اتنے بڑے کام کی کون ہمت کر سکتا ہے، اس لیے عام مسلمانوں خصوصاً اس کے صاحب ثروت طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اس کار خیر میں ان کا ہاتھ بٹائے اور پوری فیاضی سے مسجد کی عمارتوں کی تکمیل میں حصہ لے، یہ مسجد کی بھی خدمت ہے، اور دار العلوم کی بھی۔

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر "البلاغ" بمبئی

(۲)

فراغت کے بعد دہلی میں تدریس و تعلیم کی خدمت

قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کے بعد دہلی میں کس قسم کی زندگی بسر کی؟ اس کے ذکر سے بھی کتابیں خاموش ہیں، مگر قرائن اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعلیمی و تدریسی مشغلہ اختیار کیا تھا، ان کے درس سے ان کے کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، جن میں ان کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ فخر الدین اور شیخ رضی الدین مشہور ہیں، ان میں سے مقدم الذکر دونے قیام دہلی ہی کے زمانہ میں شہرت و ناموری حاصل کر لی تھی، شیخ رضی الدین ردولی میں عہدۂ قضا پر فائز ہوئے اور شیخ صفی الدین ردولی آکر سید اشرف سمنانی کے مرید و خلیفہ ہوئے، اور اپنے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی جو ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے، سید اشرف سمنانی کی ارادت میں دیدیا،

ہمارا یہ دعویٰ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے خلاف ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، تذکرہ علمائے ہند میں شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین ابن نظام الدین کے حال میں ہے کہ

چوں حادثۂ مغل در دہلی رو نمودہ بعہد سلطان　　　جب دہلی میں مغلوں کا فتنہ شروع ہوا تو بعہد

ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین و شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی بجونپور قدوم آوردند، قاضی دخترے داشت او را بشیخ نصیر الدین بن نظام الدین منکوح فرمود، ازو سہ پسر بوجود آمدند، صفی الدین، فخر الدین، رضی الدین، و ہر یکے بخدمت قاضی شہاب الدین جد مادری خود باکتساب علوم متداولہ دانشمند متبحر شدند. شیخ صفی الدین بعد فراغ بدرس علوم متعارفہ پرداخت، و بعضے کتب عربیہ و فارسیہ از شروح و متون تصنیف فرمود..... شیخ صفی الدین مدتے بدرس و تدریس گذرانید، بالآخر بتلاش شیخ وارد ردولی گشت، ہمدران زمان سید اشرف جہانگیر درآن بلدہ رونق افروز بود، چون شیخ صفی الدین بخدمتش رسید اشرف قدس سرہ بمجرد دیدنش برخاست و قریب خود نشانید، وہماں ساعت وے را بسلسلہ چشتیہ نظامیہ مرید گرفتہ خرقۂ خلافت عطا فرمود، برادرش خود

سلطان ابراہیم شاہ شرقی قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے، قاضی صاحب کی ایک دختر تھی جس کا نکاح شیخ نصیر الدین بن نظام الدین سے کر دیا، ان سے تین لڑکے پیدا ہوئے صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین اور سب کے سب اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم متداولہ حاصل کرکے متبحر عالم ہوئے، شیخ صفی الدین نے فراغت کے بعد علوم متعارفہ کے پڑھنے پڑھانے کا کام شروع کیا، اور عربی و فارسی میں بہت سی شرحیں اور متن میں کتابیں لکھیں، پھر ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیکر شیخ کی تلاش میں ردولی آگئے، اس زمانہ میں سید اشرف سمنانی بھی وہاں تشریف لائے تھے، جب شیخ صفی الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کو دیکھتے ہی بڑھکر استقبال کیا اور اپنے پاس بٹھایا اور شیخ صفی الدین کو اسی وقت سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں داخل کرکے خرقۂ خلافت

شیخ رضی الدین دران ہنگام بردولی عہدۂ قضا داشت، شیخ صفی الدین ہم درانجا رخت اقامت انداخت۔[1]

عطا فرمایا، اس زمانہ میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ رضی الدین ردولی میں قاضی تھے، اسلیے شیخ صفی الدین نے بھی وہیں اقامت اختیار کرلی۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے حال میں لکھتے ہیں:-

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین ردولوی دوازدہم ربیع الثانی سال ہفتصد و ہشتاد و نہ ولادت یافتہ، چہل روزہ بود پدرش وے را بپائے سید اشرف جہانگیر سمنانی برخود انداخت، سید موصوف فرمود "ایں ہم مرید من است"[2]

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین ردولوی ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہوئے، ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ انکے والد نے ان کو سید اشرف جہانگیر سمنانی کی خدمت میں پیش کیا، سید صاحب نے انکو دیکھکر فرمایا "یہ بچہ بھی میرا مرید ہے"۔

نزہۃ الخواطر میں بھی شیخ صفی الدین کے سید اشرف سمنانی سے خلافت حاصل کرنے اور انکے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں پیدا ہونے کی تصریح موجود ہے۔[3]

ان تصریحات سے یہ نتائج نکلتے ہیں:- (۱) شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کی شادی قاضی شہاب الدین کی صاحبزادی سے ۸۰۱ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے بہت پہلے دہلی میں ہوگئی تھی، اور قاضی صاحب کے تینوں نواسے وہیں پیدا ہوئے، اور وہیں اپنے جد مادری سے تحصیل و تکمیل کی، (۲) قاضی صاحب کے ساتھ ان کی لڑکی، داماد اور نواسوں کے جونپور آنے سے پہلے ان کے منجھلے نواسے شیخ رضی الدین، ردولی کے قاضی مقرر ہوکر وہیں مقیم ہوگئے تھے، ان ہی

۱ تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۶ ۲ ایضاً ص ۷، ۳ نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۰ و ص ۳۱

ایام میں بڑے نواسے شیخ صفی الدین بھی شیخ کی تلاش میں ردولی آئے اور سید اشرف سمنانیؒ سے مرید ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی قاضی رضی الدین کے ساتھ ردولی میں بس گئے، اور یہیں ان کے صاحبزادے ابوالمکارم اسمٰعیل ۷۸۹ھ میں پیدا ہوئے، جو بچپن ہی میں سید اشرف کی نسبت سے مشرف ہو گئے، (۳) اس طرح قاضی صاحب اور ان کے نواسوں کے دہلی سے ترکِ وطن کرنے ۸۰۱ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے پہلے ہی یہ دونوں نواسے ردولی میں آباد اور متاہل ہو چکے تھے، اور ان کو سید اشرف سمنانیؒ سے تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس تعلق سے خود قاضی صاحب اور سید اشرف سمنانیؒ میں قیام دہلی کے زمانہ ہی میں موانست قائم ہو چکی تھی، جو آگے چل کر علمی و روحانی تعلق کا باعث بنی، اور جونپور میں اس کی تجدید ہوئی، (۴) تذکرۂ علمائے ہند کی عبارت سے واضح طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب کی دختر کا نکاح شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کیساتھ جونپور آنے کے بعد ہوا، اور انکے تینوں نواسے اور شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل جونپور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہیں اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، مگر ابہام ضرور ہوتا ہے، غالباً اسی لیے بعض تذکرہ نویسوں نے ان حضرات کی پیدائش اور تعلیم و تربیت جونپور میں بیان کی ہے، نزہۃ الخواطر میں قاضی رضی الدین کے بارے میں ہے ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علی جدہ (لمعہ الشہاب ص ۱۱۵)، حالانکہ وہ قاضی صاحب وغیرہ کے جونپور آنے سے بہت پہلے ردولی میں عہدۂ قضا پر مامور ہو چکے تھے، اسی طرح شیخ فخر الدین کے بارے میں بھی یہ عبارت محلِ نظر ہے کہ ولد ونشأ بجونپور وقرأ العلم علی جدہ (لمعہ الشہاب ج ۲ ص ۱۱۵) تینوں نواسوں کا اپنے نانا سے تعلیم حاصل کرنا تو مسلم ہے مگر ان سب کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا جونپور میں آنے کے بعد ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ سب مراحل دہلی میں طے ہو چکے اور انکی شہرت ہو چکی تھی،

یہ زمانہ مشرقی دنیائے اسلام کے لیے بڑا پُرآشوب تھا، اس سے کئی صدی پہلے تاتاریوں نے جو تباہی و بربادی برپا کی تھی اور عالمِ اسلام میں ابھی اس کے اثرات باقی ہی تھے کہ ۷۷۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وہ وسط ایشیا کو روندتا ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی میں داخل ہو گیا،

اس کی یورش سے دہلی ہر وقت خطرات کی زد میں رہتی تھی، اور یہاں کے باشندے بڑی بے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے تھے، یہی زمانہ قاضی شہاب الدین کے دینی اور علمی میدان میں آنے کا ہے، ظاہر ہے کہ جس پُرآشوب دور میں پرانی علمی اور روحانی محفلوں کو بھی ان ویرانی کا خطرہ ہو، اس میں کسی نئی درسگاہ کو مرکزیت و مرجعیت حاصل ہونا مشکل تھا، مگر قاضی صاحب نے ان ہی ناسازگار حالات میں اتنی شہرت و ناموری حاصل کی کہ جونپور کے مشرقی دربار تک میں ان کے علم و فضل کا شہرہ گونج رہا تھا، اور سلطان ابراہیم کے دربار میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا،

فتنۂ تیموری میں دہلی سے کالپی کی طرف روانگی

قاضی صاحب کے ایک استاذ مولانا عبد المقتدر دہلی کی تباہی سے پہلے ۷۹۱ھ میں وصال فرما چکے تھے، اور دوسرے استاذ مولانا خواجگی بقید حیات رہ کر افادہ و ارشاد میں مصروف تھے کہ ان کے روحانی برادر اور شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلیؒ کے مرید و خلیفہ سید محمد بن یوسف گیسو دراز نے خواب دیکھا کہ تیموری فتنہ کا سیلاب دہلی تک آگیا ہے، سید محمد صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، مولانا خواجگی نے جب ان کا یہ خواب سنا تو فتنہ سے چند ماہ یا چند روز پہلے ہی دہلی سے کالپی کے لیے روانہ ہو گئے، قاضی صاحب کو استاذ و شیخ کی جدائی گوارا نہ ہوئی، کیونکہ مولانا عبد المقتدر کی وفات کے بعد یہی ان کی علمی و روحانی زندگی کے مربی رہ گئے، نیز دہلی کے حالات علم اور اہل علم کے بارے میں تیزی سے ناسازگار ہوتے جا رہے تھے، اس لیے قاضی صاحب بھی مولانا خواجگی کے ہمراہ کالپی روانہ ہو گئے، یہ ۸۰۱ھ کی بات ہے، مولانا خواجگی نے کالپی میں رختِ سفر ڈال دیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی، یہانتک کہ اسی مقام میں سات آٹھ سال کے بعد ۸۰۹ھ میں وصال فرمایا، مگر قاضی صاحب کو

کالپی کی آب و ہوا راس نہیں آئی، اور اس پیکر علم کے مزاج نے دہلی کی طرح یہاں بھی اطمینان و سکون کی فضا نہیں پائی، اس لیے دیار پورب کا رخ کیا اور جونپور آگئے، اس واقعہ کو تمام تذکرہ نگاروں نے بیان کیا، مگر کسی نے کالپی میں قاضی صاحب کے اقامت کی تصریح نہیں کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی رواروی کی حالت میں گئے اور فوراً ہی وہاں سے واپس ہوگئے، اس کی بھی تصریح نہیں ملتی ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے پھر دہلی واپس گئے ہوں اور وہاں سے جونپور آئے ہوں، اخبار الاصفیاء میں ہے:

درسنہ ہشتصد ہجری کہ صاحبقران بہند جالش فرمود، او ہمراہ استاد خود مولانا خواجگی کہ خلیفہ نصیر الدین محمود اودھی است، از وطن گاہ برآمد، مولانا خواجگی در کالپی آرام گزید و بے بجونپور آمدہ علم توقف برزد، و کوس شہرت فرو کوفت[1]	۸۰۰ھ میں جبکہ امیر تیمور صاحبقران نے ہندوستان کا رخ کیا، قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ اپنے وطن دہلی سے نکل گئے، مولانا خواجگی نے کالپی میں آرام کیا، اور قاضی صاحب نے جونپور آکر اقامت اختیار کی اور شہرت و ناموری پائی۔

اس میں قاضی صاحب کے مولانا خواجگی کے ساتھ نکلنے کی تصریح ہے، مگر ان کے کالپی جانے کی تصریح نہیں ہے، البتہ دوسری کتابوں میں ان کا کچھ دنوں کے لیے کالپی جانا صراحت کے ساتھ مذکور ہے، سبحۃ المرجان میں ہے۔

خرج القاضی شہاب الدین صحبۃ استاذہ الی کالپی فاقام مولانا خواجگی بکالپی و ذھب القاضی	قاضی شہاب الدین اپنے استاد کی معیت میں کالپی گئے، مولانا خواجگی تو وہیں رہ گئے، مگر قاضی صاحب جونپور چلے گئے۔

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی ہے:

قاضی شہاب الدین ہمراہ استاد خود مولانا خواجگی از دہلی بکالپی شتافت، مولانا خواجگی بکالپی رخت اقامت انداخت، و قاضی بجونپور رفت[1]	قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ دہلی سے کالپی گئے، مولانا خواجگی نے تو کالپی ہی میں اقامت اختیار کرلی، اور قاضی صاحب جونپور چلے گئے۔

مولانا خواجگی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں درس و تدریس میں گذار چکے تھے، اس لیے ان کو کالپی کا گوشہ راس آگیا، اور چند سال وہاں ترک و تجرید اور عبادت و ریاضت میں گذار کر ۸۰۹ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کے جوان عزم و جوان ہمت شاگرد کو یہاں کام کرنے کے مواقع و امکانات کم نظر آئے، اس لیے وہ اپنے استاد کو کالپی میں چھوڑ کر جونپور چلے آئے۔

کالپی سے جونپور میں آمد

اس وقت جونپور شاہان شرقیہ کے حسن انتظام، علم دوستی اور ارباب علم و فضل کی قدردانی میں دہلی ثانی تھا، اور دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کی ساری علمی و دینی رونق کھنچ کر جونپور میں چلی آئی تھی، خصوصاً سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے تخت نشین ہونے کے بعد ۸۰۴ھ میں دیار پورب دیار العلم والعلماء بن گیا تھا، اور یہاں کے قریات و قصبات علم و فضل کے گہوارے ہوگئے تھے، قاضی نصیر الدین دہلوی جونپوری، شیخ ابوالفتح بن عبدالحی بن مولانا عبدالمقتدر تہی دہلوی، جونپوری، شیخ نصیر الدین بن نظام الدین غزنوی، دہلوی، جونپوری، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی، اور شیخ محمد بن عیسی دہلوی جونپوری وغیرہ فتنۂ تیموری کے بعد دہلی سے جونپور چلے آئے تھے، ان ہی ایام میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے کالپی گئے اور وہاں سے جونپور آگئے، شاہ

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸

عبدالحق صاحب کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے دہلی آئے، پھر یہاں سے جونپور تشریف لے گئے، شیخ ابو الفتح ترکی کنذی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

شیخ ابوالفتح اول در دہلی بود، در واقعہ صاحب قران امیر تیمور با بعضے دیگر از اکابر شہر جونپور رفت، و قاضی شہاب الدین ہمدران واقعہ از دہلی بدانجا رفتہ است[1]	ابتدا میں شیخ ابوالفتح دہلی میں تھے، امیر تیمور کے فتنہ میں دوسرے اکابر کے ہمراہ جونپور چلے گئے، اسی واقعہ میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے اس جگہ پہنچے۔

قاضی صاحب کے ساتھ ان کی صاحبزادی، داماد شیخ نصیر الدین اور ان کے والد شیخ نظام الدین غزنوی بھی مع دیگر اہل خانہ کے دہلی سے جونپور آکر مستقل طور سے آباد ہوگئے، قاضی صاحب کے دو نواسوں قاضی رضی الدین اور شیخ صفی الدین کے پہلے ہی سے رودولی میں سکونت اختیار کر لینے کی تصریح گذر چکی ہے، تذکرۂ علمائے ہند میں ہے

چون حادثۂ مغل در دہلی روئے نمود بعہد سلطان ابراہیم شرقی قاضی شہاب الدین و شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی بجونپور تشریف آوردند[2]	جب دہلی میں مغل حادثہ رونما ہوا تو بعہد سلطان ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے۔

اغلب یہ ہے کہ قاضی صاحب، ان کی لڑکی اور داماد کے جونپور آنے کے محرک شیخ صفی الدین اور شیخ قاضی رضی الدین رہے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی سے بات چیت کرکے اپنے نانا اور دادا وغیرہ کو جونپور آنے کی دعوت دی ہو،

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۷

قاضی صاحب اور ان کے متعلقین کے جونپور آنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سلطان ابراہیم شرقی کی سلطنت قائم ہو چکی تھی، اور سید اشرف سمنانی بقید حیات تھے، سلطان ابراہیم بن خواجہ جہاں شرقی کی حکومت اس کے بھائی سلطان مبارک شاہ شرقی کے بعد ۸۰۴ھ میں شروع ہوئی اور سید اشرف سمنانی کا وصال ۸۰۸ھ میں ہوا، اسی درمیان میں قاضی صاحب جونپور تشریف لائے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کی بربادی کے نتیجہ میں جونپور آباد ہو رہا تھا، اور ہند و بیرون ہند کے علماء، فضلاء، مشائخ اور دانشوروں کے قافلے یہاں چلے آرہے تھے، طبقات اکبری میں اس دور کے جونپور کا نقشہ یہ درج ہے کہ "سلطان مبارک شاہ شرقی کے مرنے پر جب سلطان ابراہیم شاہ شرقی سریر آرائے سلطنت ہوا تو امن و امان کی فضا میں عوام و خواص نے سکون کا سانس لیا اور جو علماء و مشائخ آشوب زمانہ سے پریشان تھے، وہ جونپور چلے آئے، وہ اس زمانہ میں دار الامان تھا، اور شرقی سلطنت علماء کی کثیر تعداد کے آنے سے دار العلوم بن گئی[1]۔ تاریخ فرشتہ نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ "آشوب زمانہ کے مارے ہوئے ہندوستان کے اطراف و اکناف کے لوگ جونپور چلے آئے تھے، یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اعزاز حاصل ہوا، علماء، مشائخ، سادات اور خدام وغیرہ ہر طبقہ کے اعیان اس طرح جمع ہو گئے کہ جونپور دہلی ثانی کہلانے لگا، لوگوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت سمجھ کر حیات دو روزہ کو اس نشاط و انبساط سے بسر کیا کہ شاہ سے لیکر گدا تک سب خوش اور مطمئن تھے، اور غم و اندوہ اس دیار سے اپنا بوریا بستر باندھ چکا تھا[2]۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی قدردانی اور جونپور میں اقامت

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، جو قرین قیاس

[1] طبقات اکبری ص ۵۲۸ طبع نولکشور [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

بھی ہے۔ قاضی صاحب کی علمی شہرت قیام دہلی کے زمانہ میں عام ہوچکی تھی۔ ان کی درسگاہ کے دو فضلاء جوان کے نواسے بھی تھے، ردولی میں موجود تھے، ایک عہدۂ قضا پر مامور تھے، اور دوسرے درس وتدریس میں نام پیدا کرکے طریقت میں سید اشرف سمنانیؒ سے منسلک ہوگئے تھے، ان کے علاوہ قاضی صاحب کے جو احباب و معاصرین اور شرکائے درس جونپور آچکے تھے، انھوں نے بھی ان کی شہرت و قابلیت کا تذکرہ کیا ہوگا، خصوصاً قاضی نصیرالدین گنبدی جو قاضی صاحب کے استاذ مولانا عبدالمقتدر کے مشہور تلامذہ میں تھے، اور شیخ ابوالفتح شرحیؔ جو مولانا عبدالمقتدر کے پوتے اور ان کے فیض یافتہ تھے۔ ان کی آمد سے جونپور میں قاضی صاحب کے علم و فضل کا چرچا ہوا ہوگا، ان کے کمالات سنکر سلطان ابراہیم نے قاضی صاحب کو دعوت دی ہوگی، تجلی نور میں ہے:

مولانا خواجگی بکالپی توطن کرد، وقاضی حب الطلب سلطان ابراہیم شرقی بجونپور تشریف آورد[1]

مولانا خواجگی نے کالپی کو وطن بنایا اور قاضی شہاب الدین سلطان ابراہیم شرقی کی طلب پر جونپور تشریف لائے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے جس عقیدت اور قدر و منزلت کے ساتھ قاضی صاحب کا استقبال کیا وہ اس کی دعوت سے کہیں بڑھ کر تھا، سبحۃ المرجان میں ہے:

فاغتنم السلطان ابراهیم الشرقی والی جونفور ورودہ ونفرہ سقاہ اللہ سحائب الاحسان وزودہ وعظمہ بین الکبراء ولقبہ بملک العلماء[2]

والی جونپور سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کی آمد کو غنیمت سمجھا اور اپنے امراء دولت اور کبرائے مملکت میں ان کو بلند مقام دیکر ملک العلماء کے خطاب سے ملقب کیا۔

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۳۳ [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹

اسی کا ترجمہ تذکرہ علمائے ہند میں ہے "سلطان ابراہیم شرقی قدوم قاضی مغتنم شمردہ باعزاز و تعظیم تمام پیش آمدش، واورا بملک العلماء ملقب کرد"[1] تاریخ فرشتہ اور تجلی نور میں اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "سلطان در تعظیم و توقیر او بسیاری کوشید، ودر مجلس خود برکرسی نقرہ جا داد، وقاضی القضاۃ کرد"[2] مگر لطائف اشرفی میں ہے کہ ملک العلماء کا لقب قاضی کو سید اشرف سمنانی نے اس وقت دیا تھا جب ان کو خرقۂ خلافت سے نوازا تھا،[3] ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کے عطا کردہ لقب کو سلطان ابراہیم شاہ نے سرکاری حیثیت دیدی ہو،

قاضی صاحب نے جونپور کے محلہ خواجگی میں سکونت اختیار فرمائی اور یہیں اپنا مکان اور مدرسہ بنوایا، تجلی نور میں ہے "مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیرفت وبعد فوت متصل آں محلہ دروازۂ جنوبی مسجد اٹالہ مدفن یافت"۔ (ج ۲ ص ۳۰) یہ معلوم نہیں کہ پہلے ہی سے یہ مقام اور محلہ خواجگی کے نام سے آباد و مشہور تھا، یا قاضی صاحب نے یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے استاذ و مرشد مولانا خواجگی کے نام پر اس محلہ کا نام رکھا، جو صورت بھی ہو، یہاں قاضی صاحب کی سکونت اپنے شیخ و استاذ سے عقیدت و محبت اور نسبت کا پتہ دیتی ہے ؎

نسیم بوئے تو ام زیں دیار می آید
دریں دیار ازاں سرخوشیم گہ گاہے

قاضی صاحب جونپور میں کیا رونق افروز ہوئے کہ دیار پورب کے علمی و روحانی سلسلہ کی وہ تمام دولت جو دہلی میں لٹ رہی تھی، سمٹ سمٹا کر پھر پورب میں آگئی، اور آٹھویں صدی میں اودھ کی جو روشنی دہلی کے میناروں پر ہو رہی تھی، وہ نویں صدی کے شروع ہوتے ہی

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۰ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴ [3] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۱

جونپور کی فصیلوں پر ہونے لگی جس سے دیار پورب کے بام و در چمک اٹھے، اس طرح اس دیار کی متاعِ علم و فن پھر اسی دیار میں لوٹا دی گئی۔ هٰذه بضاعتنا ردت الینا۔

قاضی صاحب کو سارا علمی و روحانی سرمایہ شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور انکے تلامذہ شیخ شمس الدین اودھی اور شیخ نصیر الدین اودھی سے ملا تھا، ان کے دونوں استاد و مرشد مولانا عبد المقتدر اور مولانا خواجگی اسی دبستانِ علم و معرفت کے فضلا میں تھے، اس لیے آپ نے بھی اس خانوادہ کی روایات کے مطابق جونپور میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا،

قاضی وسادۂ افادہ و درس بجونپور مزین فرمود و بتصنیف کتب مصروف گردید[1]	قاضی صاحب نے جونپور میں درس و افادہ کی مسند کو زینت دی اور کتابوں کی تصنیف کا شغل اختیار کیا،

اس وقت جونپور میں متعدد نامور علما و فضلاء کی درسگاہیں تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دے رہی تھیں، قاضی صاحب کے شریکِ درس اور قاضی عبد المقتدر کے تلامذہ میں ان کے پوتے شیخ ابو الفتح اور شیخ نصیر الدین کے حلقہ ہائے درس خاص طور سے مرجع بن رہے تھے، مولانا فقیہ حیرتی کا حلقۂ درس الگ قائم تھا، ان حضرات کے علاوہ دوسرے علما و فضلا بھی تعلیم و تعلم میں مصروف تھے، ان ہی میں قاضی صاحب نے بھی اپنا حلقہ قائم کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں علما اور مشائخ دونوں طبقوں میں ان کی درسگاہ کی افادیت و اہمیت کا عام چرچا ہو گیا، چنانچہ شیخ فتح اللہ اودھی نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد بن عیسیٰ کو قاضی صاحب ہی کے پاس بھیجکر علوم شرعیہ و ظاہریہ کی تحصیل و تکمیل کرائی، پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ بعد میں

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۸

اکثر علما و فضلا نے درس و تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور آخر میں صرف قاضی صاحب کا مدرسہ باقی رہ گیا تھا یا چند اور مدارس رہ گئے تھے جن میں ان کے مدرسہ کو اہمیت و خصوصیت حاصل تھی، قاضی صاحب کی تدریسی خدمات میں اسکی تفصیل آئے گی،

علمائے وقت کی حسد کی ایک روایت اور اس پر تنقید

قاضی صاحب کے جونپور تشریف لانے پر ان کا شاہانہ استقبال اور بڑا اعزاز و اکرام ہوا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور امرائے دولت شرقیہ نے پرجوش استقبال اور علما و مشائخ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعزاز و اکرام نے قاضی صاحب کے حاسد بھی پیدا کر دیے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ

آوردہ اند کہ علمائے وقت را پیمانۂ حسد لبریز شد شمہ ازاں بمولانا نوشت مولانا ایں دو بیت سعدی در جوابش نگاشت	بیان کیا جاتا ہے کہ علمائے وقت کے حسد کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو قاضی صاحب نے اشارۃً مولانا کو لکھا ہے، مولانا نے اس کے جواب میں سعدی کے دو اشعار لکھ بھیجے

اے بیش ازاں کہ در قلم آید ثنائے تو	واجب بر اہلِ مشرق و مغرب دعائے تو
اے دریغائے ذات تو نفع جہانیاں	باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو[1]

لیکن یہ روایت کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذری۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی عقیدت و فریفتگی

سلطان ابراہیم شاہ شرقی بڑا نیک دل، علم پرور، علما نواز اور خدا پرست فرمانروا تھا، اسے علما و مشائخ سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کی خدمت و تعظیم و تکریم میں اپنی سعادت سمجھتا تھا، اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں قاضی صاحب

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۶۰

کو سر آنکھوں پر رکھا، فرشتہ کا بیان ہے "سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید، و در روز ہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست"۔ فرشتہ ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب زیادہ بیمار پڑ گئے، سلطان ابراہیم کو خبر ہوئی تو مزاج پرسی اور عیادت کے لیے ان کے گھر پر حاضر ہوا اور مزاج پرسی اور اظہار محبت و تعلق کے بعد پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگایا اور اسے قاضی صاحب کے سر کے گرد گھمایا اور یہ کہکر اس کا پانی پی گیا کہ

بار خدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد	خداوندا! ہر وہ مصیبت جو قاضی صاحب
نصیب من گرداں، و او را شفا بخش	پر آنے والی ہو اسے میرے نصیب میں ڈالدے
	اور ان کو شفا بخش دے،

تخت و تاج اور علم و دانش کی تاریخ میں یہ واقعہ یادگار رہیگا کہ سلطان ابراہیم ملک العلماء کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا، جو قاضی صاحب کے علم و فضل و کمال کے اعتراف اور علماء و فضلاء سے سلطان کی محبت و عقیدت کا اعلیٰ نمونہ ہے، فرشتہ نے اس واقعہ پر سلطان کے بارے میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے:

ازیں جا عقیدۂ آں صاحب تخت و تاج	اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس
نسبت بعلمائے شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	صاحب تخت و تاج بادشاہ کو شریعت محمدی کے
معلوم می تواند کرد، تا چہ غایت بود	علماء سے کس درجہ عقیدت تھی۔

قاضی صاحب کو بھی سلطان سے کچھ کم محبت نہ تھی، اگر سلطان ان پر جان چھڑکتا تھا تو بقول فرشتہ قاضی صاحب نے اس پر جان چھڑک ہی دی اور اسکے بعد زیادہ دنوں زندہ نہ رہے،

قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر	قاضی شہاب الدین نے بھی سلطان کا پورا
موافقت کردہ چنداں از فوت شاہ	پورا ساتھ دیا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی

ابراہیم شاہ شرقی مغموم گشت کہ ہماں	کے انتقال پر وہ اس قدر غمگین ہوئے کہ
سال یعنی اربعین و ثمانمائۃ بعالم قدس	اسی سال ۸۴۰ھ میں رحلت فرما گئے اور
تشریف برد، والبقاء للملک المعبود	بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو سال کے بعد
و بعضے گویند کہ بدو سال بعد از فوت	۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح باغ جنت
سلطان ابراہیم طائر روحش در سنہ	کو پرواز کر گیا،
اثنی و اربعین و ثمانمائۃ روضۂ رضوان	
پرواز کرد۔[1]	

قاضی صاحب اور سلطان ابراہیم میں قلبی تعلق کا نتیجہ تھا کہ سلطان ان سے تمام علمی و دینی امور و معاملات اور افراد و رجال کے بارے میں مشورہ کیا کرتا تھا، اور ان کو پوری شرقی سلطنت کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا، اور ان ہی کے مشورے سے قضاۃ کا تقرر کرتا تھا، حاجتمندوں کے بارے میں قاضی صاحب کی سفارش کا خاص خیال رکھتا تھا، سید اشرف سمنانی جیسے بزرگ تک سلطان سے اپنے متوسلین و متعلقین کی سفارش میں قاضی صاحب کو وسیلہ بناتے تھے، سلطان کی علم دوستی کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی دربار میں قاضی صاحب اور دوسرے علماء کے درمیان مباحثہ و مناظرہ کی دینی و علمی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا، اس طرح ملک العلماء کا علمی دربار سجاتا تھا، ان دونوں شاہ و گدا یعنی سلطان الشرق اور ملک العلماء کے تعلقات پہلے دن سے لیکر آخری دن تک یکساں شگفتہ رہے، چالیس سالہ مدت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، اس سے دونوں کے ظرف و حوصلہ اور تعلقات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے، ان دونوں کا تذکرہ لازم و ملزوم بن گیا ہے، جو صرف الحب للہ

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

کا نتیجہ ہے۔

حضرت سید اشرف سمنانی کی عنایات و توجہات

قاضی شہاب الدین کو ملک العلما، اور قاضی القضاۃ بنانے میں بادشاہ کی مرحمت خسروانہ کے ساتھ ملک العلما کے قلندرانہ فقر کو بھی بڑا دخل ہے، اور نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے، قاضی صاحب جس زمانہ میں یہاں آئے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ کا آخری زمانہ تھا، ان کی مقبولیت و شہرت اپنے کمال عروج پر تھی، سید صاحب سمنان میں پیدا ہوئے، اور وہیں مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی، پھر ترک و تجرید اختیار کرکے عالم اسلام کی سیر و سیاحت فرمائی، اور علم و عرفان کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کرکے آخر میں ہندوستان آئے، اور سندھ میں شیخ جلال الدین بخاریؒ سے، بہار میں شیخ شرف الدین منیریؒ سے اور بنگال میں شیخ علاء الدین لاہوریؒ وغیرہ سے کسب فیض کرکے جونپور آئے، جہاں شرقی سلطنت کے بدولت ہر قسم کا امن و سکون تھا یہیں روح آباد عرف کچھوچھہ نامی مقام پر سکونت اختیار فرمائی، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے، آپ شیخ وقت ہونے کے ساتھ نامور عالم و مصنف بھی تھے، ان کی جامعیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے، تفسیر میں نور بخشیہ، فقہ میں حاشیہ ہدایہ، فتاوی اشرفیہ، حاشیہ فصول، مختصر اصول فقہ، نحو میں رسالہ اشرفیہ، علم کلام میں قواعد العقائد ادب میں دیوان اشعار، تاریخ و انساب میں بحر الانساب اور اشرف الانساب کے علاوہ ارشاد و تلقین اور سلوک و تصوف میں ان کی متعدد و معیاری تصانیف ہیں، جن سے انکی علمی استعداد و قابلیت کا پتہ چلتا ہے، قاضی شہاب الدین اور سید اشرف میں یہی علمی ذوق وجہ اشتراک ثابت ہوا، جب دونوں ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکتب فکر کے دو عالم مل گئے ہیں، فرق صرف یہ تھا کہ سید صاحب پر مشیخت کا رنگ غالب تھا اور قاضی صاحب

صاحب علم و فن کا، مگر دونوں ہم ذوق و ہم فکر تھے، قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی کو سید صاحب سے بہت پہلے سے روحانی نسبت حاصل تھی، ان کے صاحبزادے ابو المکارم اسمٰعیل کو بھی سید صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، اس لیے قاضی صاحب اور سید صاحب میں پہلے سے ایک گونہ روحانی و علمی تعلق قائم ہو چکا تھا جس نے بعد میں مرشد و مسترشد کی نسبت اختیار کرلی، تعجب ہے کہ قاضی صاحب اور سید صاحب کے گونا گوں تعلقات اور ان کی بیعت و خلافت کا تذکرہ کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی نظر سے لطائف اشرفی کی وہ تصریحات نہیں گذر سکیں جن میں دونوں بزرگوں کے احوال و کوائف اور سید صاحب کی قاضی صاحب پر خاص توجہات و عنایات کا ذکر ہے، صرف شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے سید صاحب کے ایک مکتوب کے پیش نظر قاضی صاحب کو ان کا معاصر بتایا ہے، اور سید صاحب کے ذکر میں ان کے اس بائیسویں مکتوب کو درج کیا ہے۔

و از مکتوبات ست مشتمل بر تحقیقات	سید اشرف کا ایک خط ان کے معاصر قاضی
غریبہ با قاضی شہاب الدین دولت آبادی	شہاب الدین دولت آبادی کے نام ہے
معاصر بود، غالباً قاضی از وے تحقیق	جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہے، غالباً قاضی صاحب
ایمان فرعون کردہ در خصوص اشارتے	نے سید صاحب کو فرعون کے ایمان کے بارے
بداں واقع شدہ است کردہ بود	میں خط لکھا تھا جس کی طرف فصوص الحکم
و دریں باب وے مکتوبے نوشتہ[1]	میں اشارہ ہے۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی اخبار الاخیار سے یہی عبارت نقل کر دی ہے،[2]

۱؎ اخبار الاخیار ص ۱۶۱ و ص ۱۶۲ ۲؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳

حالانکہ ان دونوں بزرگوں میں معاصرت سے بڑھ کر مرید و مرشد اور محبت و مودت کا رشتہ قائم تھا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد سید اشرف سمنانی ہی قاضی صاحب کے خاص قدردان و مداح رہ گئے تھے، اور قاضی صاحب کو بھی ان سے ارادت و خلافت کی نسبت سے بڑا گہرا تعلق تھا، اس حقیقت کا اظہار صرف لطائفِ اشرفی سے ہوتا ہے، جو سید صاحب کے ملفوظات و حالات میں نہایت مستند کتاب ہے اور جسے ان کے خادم و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی معاصر قاضی شہاب الدین نے لکھا ہے۔ اس کی تالیف غالباً قاضی صاحب کی زندگی میں ہوئی ہے، ہم اس سلسلہ کی ضروری باتیں لطائفِ اشرفی سے نقل کرتے ہیں، انکے بغیر قاضی صاحب کا ذکر جمیل نامکمل رہے گا۔

قاضی صاحب کی سید اشرف سے پہلی ملاقات

جونپور میں سید صاحب اور قاضی صاحب کی پہلی ملاقات

اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ سید اشرف صاحب اپنے خدام و احباب کے ساتھ روح آباد (کچھوچھہ) سے جونپور تشریف لائے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی جامع مسجد میں قیام فرمایا، سلطان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق آپ کی زیارت کے لیے حاضری کا ارادہ کیا، مگر قاضی شہاب الدین نے سلطان سے کہا کہ سید اشرف کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے پایہ کے بزرگ ہیں، ان کے مزاج سے واقفیت نہیں ہے، بہتر ہے کہ پہلے ان سے مل کر ان کا طور و طریقہ معلوم کیا جائے، سلطان نے اس رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ قاضی صاحب علماء کی ایک جماعت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب اس وقت ظہر کی نماز ادا کرکے اوراد و وظائف میں مشغول تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ملاقات کے لیے آرہے ہیں تو دریافت فرمایا کہ کون آرہا ہے، خدام نے عرض کیا

قاضی شہاب الدین کہ منسوب بجمیع علوم و — یہی وہ قاضی شہاب الدین ہیں جو تمام

مشہور بہمہ فنون شدہ است، ایشانند — علوم و فنون میں مشہور اور ان سب میں ماہر ہیں۔

یہ سنکر سید صاحب ان کے استقبال کے لیے بڑھے، قاضی صاحب سید صاحب کو آتا دیکھکر پالکی سے اتر پڑے اور اپنے ہمراہی علماء و فضلاء کو ہدایت کی کہ اس ملاقات میں کوئی شخص اپنی برتری ظاہر کرے اور نہ کوئی علمی سوال چھیڑے، کیونکہ

کہ در حسن جبین سید نور ولایت می تابد — کیونکہ سید صاحب کی پیشانی کے حسن و جمال میں ولایت کا نور چمکتا ہے۔

سید صاحب نے نہایت ادب و احترام سے قاضی صاحب کو بٹھایا، دونوں میں مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو رہی، اسی اثنا میں منع کرنے کے باوجود قاضی صاحب کے بعض ساتھیوں نے درسیات اور علم کلام کی بعض بحثیں چھیڑ دیں، اس مجلس میں سید صاحب کے مرید شیخ ابو الوفا خوارزمی بھی موجود تھے، جو تمام علوم و فنون میں کمال رکھتے تھے، انھوں نے اس بحث پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ تمام حاضرین مطمئن ہو گئے۔

قاضی صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ آج سلطان ابراہیم آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہونے والے تھے، مگر اس خادم نے چاہا کہ پہلے خود شرفِ زیارت حاصل کرلے، انشاء اللہ کل سلطان حاضر خدمت ہوں گے، اس کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا

نزدیک فقیر شما از سلطان بسیار بہتر آید — فقیر کے نزدیک آپ کا مرتبہ سلطان سے بلند ہے

اگر می آید ہم حاکم اند — اگر سلطان آئے تو بادشاہ وقت ہیں، اسکو اختیار ہے

ملاقات کے بعد قاضی صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رخصت ہو گئے، ان کے جانے کے بعد سید صاحب نے احباب سے ان کے بارے میں یہ تاثرات ظاہر فرمائے

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت در کسے — ہندوستان میں اس قدر فضیلت رکھنے والے

کم دیدہ ایم — علما، ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔

دوسرے دن سلطان ابراہیم اپنے حشم و خدم اور امرائے دولت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ سلطانی خدم و حشم سے سید صاحب کو کلفت ہوگی، اس لیے صرف بیس امرا و علما کے ساتھ سلطان نے سید صاحب سے ملاقات کی، اس زمانہ میں سلطانی فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، سید صاحب نے فتح کی بشارت دی اور جب سلطان رخصت ہونے لگا تو سید صاحب نے اس کو اپنی خاص مسند عنایت فرمائی، جس سے سلطان بے حد خوش ہوا، اور دربار میں پہنچنے کے بعد سید صاحب کے متعلق یہ تاثرات ظاہر کیے:

چو سیدیست عالی جناب و مقاصد مآب — سید صاحب کس قدر عالی مرتبہ اور بامقصد بزرگ

الحمد للہ در ہندوستان چنیں مردم درآمدہ اند — ہیں، اللہ کا شکر ہو کہ ہندوستان میں ایسے آدمی پہنچے۔

اس واقعہ کے تیسرے دن قلعۂ چنار کی فتح کی خوشخبری آئی، سلطان نے دوبارہ حاضر ہو کر سید صاحب کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں تو حضرت میرؒ کے دست ارادت دے چکا ہوں، البتہ خادم زادے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوں گے، چنانچہ اسی دن دو تین شاہزادے سید صاحب سے مرید ہوئے، اور نذر پیش کی جسے آپ نے قبول نہیں فرمایا، شہزادوں نے جونپور میں مستقل قیام کرنے پر اصرار کیا، آپ نے ان کی دلجوئی کے لیے ارشاد فرمایا

از دیار سلطان بیرون نخواہیم رفت — ہم سلطان کی مملکت کے باہر نہیں جائیں گے۔

سلطان ابراہیم سید صاحب کی ان باتوں سے بہت پُر امید اور خوش ہوا، اور سید صاحب نے بھی دو مہینہ سے زیادہ جونپور میں قیام فرمایا اور وہاں کے اکابر و اصاغر

آپ سے مستفید و مستفیض ہوئے، اس مدت میں قاضی شہاب الدین کی عقیدت و محبت سید صاحب سے اسقدر بڑھ گئی کہ پابندی سے دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے ان کو قبول کرکے ان کی تحسین و تعریف فرمائی، اور بہترین تاثرات کا اظہار فرمایا، الارشاد فی النحو کو زیادہ پسند کیا اور فرمایا

گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمد — کہتے ہیں کہ جادو ہندوستان سے نکلا ہے،

غالباً ایں راست سحر بود — وہ جادو غالباً یہی کتاب ہے۔

بدیع البیان کو جو کہ علم معانی و بیان میں ہے قبول فرماکر اس کی تحسین فرمائی، فارسی تفسیر بحر المواج کے بارہ میں فرمایا:

سخن خالی از اطالتے نیست — اس کی کیفیت طوالت سے خالی نہیں ہے

اور جامع الصنائع کے متعلق جو فارسی زبان میں بدائع و صنائع پر ہے، ارشاد ہوا:

حضرت قاضی دریں فن ہم دست زدہ اند — قاضی صاحب نے اس فن میں بھی ہاتھ مارا ہے۔

سید صاحب کے ان الفاظ کا مجلس پر بہت اثر ہوا، اس مجلس میں شیخ واحدی بھی موجود تھے، انھوں نے اسی وقت سید صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا، اسے سنکر قاضی صاحب اور سید صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور تبسم فرمایا، اور سید صاحب نے قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا:

چوں ہمہ از علوم سر بردہ اید، فارسی را بشیخ گذارید — آپ تمام علوم میں ماہر و کامل ہیں، فارسی زبان کو شیخ واحدی کے لیے چھوڑ دیجئے۔

اور شیخ واحدی نے یہ درخواست پیش کی۔

لشکر علم تو بہ تیغ بیان از عجم تا عرب گرفتہ بار
چوں گرفتی عراق عربیت فارسی را بواحدی بگذار

اس سفر میں معاملہ یہیں تک رہا، جب سید صاحب دوسری بار جونپور تشریف لے گئے تو قاضی صاحب کو خرقۂ خلافت عطا فرما کر ہدایہ کا ایک خصوصی نسخہ عنایت کیا (غالباً ہدایہ کا یہ نسخہ سید صاحب کے حواشی سے مزین تھا)[1]

(باقی)

---

[1] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵ - ۱۰۶

غالب کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے دہلی واپس آگئے تھے، اور بقیہ عمر یہیں گذاری، کبھی کبھی رام پور اور دوسرے شہر کا سفر ضرور تا کر لیا کرتے تھے۔

ان کو دہلی سے بڑی محبت رہی، یہاں ان کی پوری زندگی گذری، اور یہیں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس شہر میں ان کو بہت دکھ درد بھی اٹھانا پڑا، یہیں وہ قمار بازی کے الزام میں جیل گئے، یہیں وہ اپنے قرض خواہوں کے تقاضے سے پریشان رہے، ان کے خوف سے ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ دن بھر گھر میں بند رہتے، رات کو چپکے سے نکلتے اور ملنے والوں سے جاکر ملاقات کر لیتے، اپنی زبوں حالی کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:-

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اترا تا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یہ ہے، غالب کیا مرا، ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے

ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ، عرش نشیں خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے، آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب. نواب صاحب کیسے، او غلان صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو. بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سونچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔" (خط بنام مرزا قربان علی بیگ خان صاحب خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۹۱)

اس زبوں حالی سے پریشان ہو کر اپنے شعر میں بھی کہہ اٹھے تھے:

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسدؔ ہم نے مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

لیکن پھر بھی ان کو بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب دیا، اپنا استاد بنایا، مولانا فضل حق، سر سید احمد خاں، صہبائی، شیفتہ، آزردہ، حسام الدین حیدر خاں اور امین الدین احمد خاں، نواب ضیا الدین احمد خاں نیر وغیرہ نے سر آنکھوں پہ بٹھا کر مرجع کرام و ثقات بنا دیا، اس لیے وہ اپنی پریشان حالی کو بھولکر دہلی کے سو جان سے شیدا و شیفتہ بنے رہے، غدر میں دہلی تباہ ہوئی، تو دستنبو میں ان کا رواں رواں چیخے چیخے روتا نظر آتا ہے. گو وہ وقت کے تقاضے سے پورے طور پر اپنے نالہ و شیون کو بلند نہیں کر سکے ہیں، پھر بھی دستنبو کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑا جائے تو دہلی کی تباہی کا نقشہ نظر کے سامنے اس طرح آتا ہے،

" شہر کے بلند مرتبت، دانشمند لوگوں میں کوئی نہ تھا، جو اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر گھر کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھ گیا ہو..... کھلم کھلا قہر و غضب اور بغض خصومت کو دیکھکر خوف سے سب کے چہروں کا رنگ اڑ گیا، زرداروں اور ناداروں، دونوں میں مردوں اور پردہ نشین عورتوں کی کثیر تعداد کہ شمار میں نہ لائی جا سکے ان تینوں دروازوں (یعنی اجمیری، ترکمان، دہلی دروازہ) سے نکل کھڑی ہوئی، اور چھوٹی چھوٹی بستیوں اور مقبروں میں شہر سے باہر جا کر دم لیا تاکہ واپسی کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں، یا وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہو تو رات دن سفر کر کے کسی دوسری جگہ پہنچ جائیں،........شہر بھر میں پندرہ ستمبر سے ہر مکان اور حجرے کا دروازہ بند ہے اور دوکاندار اور خریدار دونوں پابند، غلہ فروش کہاں کہ غلہ خریدیں، دھوبی کہاں کہ کپڑے دھلنے کو دیں، حجام کہاں تلاش کریں کہ سر کے بال تراشے اور خاک روب کو کہاں سے لائیں کہ صفائی کرے، ان پانچ دن میں...... لوگ بجاتے تھے اور پانی ہمیشہ اور آٹا نمک کبھی کبھی اگر مل جاتا لے آتے تھے، عاقبت کار دروازہ پتھروں سے پٹ گیا، اور دلوں کے آئینے زنگ خوردہ ہو گئے،...... خوش و ناخوش جو کچھ کھانے کو میسر تھا، کھا لیا گیا، اور پانی اس طرح سے جیسے کنواں ناخنوں سے کھودا گیا ہو، پیا گیا اور کوزہ و سبو میں پانی، اور مرد و زن میں ضبط کی آب باقی نہ رہی، صبر سے کٹنے اور آب و دانہ میسر آجانے کی ابلہ فریبی کی نوبت گذر گئی، اور دو رات دن بھوک پیاس میں بسر ہوئے..... حکم ہوا کہ چوک بازار تک جایا جا سکتا ہے، چوک سے آگے مقتل ہے، مجبور خستہ حالوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، سقا، اور مشک اور پکھال، یہ چیزیں عنقا کا حکم رکھتی تھیں، ہر گھر سے ایک مرد اور میرے نوکروں

میں سے دو نوکر گئے، چونکہ میٹھا پانی دور تھا اور دور نہیں جانا چاہتے تھے مجبوراً
کھاری پانی گھڑوں اور صراحیوں میں بھر لائے، آخر وہ آگ جس کا دوسرا نام
پیاس ہے، اس نمکین پانی سے بجھنے میں آئی، باہر جانے اور پانی لے کر آنے والے کہتے
تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں، فوجیوں نے چند مکانوں
کے دروازے توڑ دیے ہیں ...... پوشیدہ نہ رہے کہ پکڑ دھکڑ کے اس شہر آشوب
ہنگامے میں جس طرح ہر گلی کوچے میں زور وتندی کا ہنجار ایک نہیں ہے، اسی طرح
سپاہیوں کا قتل وغارت کا ڈھنگ بھی ایک نہیں، کسی طرف نرمی یا سختی کا
برتاؤ، اس کی اپنی کیفیت مزاج پر منحصر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس یلغار میں
حکم یہ ہے کہ جو کوئی سر اطاعت خم کرے اس کے مال ومتاع کے ساتھ اسکی جان
بھی لے لیں، مقتولوں نے غالباً سرکشی کی، اسی وجہ سے ان کے سر تن سے جدا کر دیے
گئے، شہرت بھی یہی ہے کہ بیشتر صورتوں میں اسباب چھین لیتے ہیں، جان نہیں لیتے،
بہت کم اور وہ بھی تین گلیوں میں ایسا ہوا ہے، کہ پہلے سر اڑایا اور اس کے بعد
مال ومتاع اٹھائے گئے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔"

دلی کی اس تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم کہیں کہیں رک جاتا ہے، اور پھر وہ واقعی
رونے لگتے ہیں،

"آفتاب برج حمل میں مقام کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اُگے اور پھول نہ کھلیں،
ہاں نظام قدرت کبھی نہیں بدلتا، اور آسمان اس مقررہ گردش کے سوا جو اس کے لیے
مخصوص ہے، کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کرتا، میں خود پر آنسو بہاتا ہوں، باغ
پر نہیں، اور مجھے مقدر سے گلہ ہے، بہار سے نہیں ...... میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں

کہ زمانہ کیسا بے پروا ہے، اگر میں کہ ایک گوشۂ اندوہ ہوں، دیوار کی جانب منہ
کیے پڑا ہوں، سبزہ وگل کو نہ دیکھ سکوں اور مشام جاں کو نکہت گل سے معطر نہ کر سکوں
تو بہار کی رونق میں کیا کمی آئے گی، اور صبا سے کون تاوان طلب کرے گا۔"

(یہ تمام اقتباسات دستنبو کے اردو ترجمے سے لیے ہیں جو مارچ ۱۹۲۹ء کے رسالہ تحریک
دہلی میں شائع ہوئے)

غدر کے بعد دلی پر انگریزوں کا پھر سے قبضہ ہوا، تو اس وقت وہاں کے لوگوں
خصوصاً مسلمانوں کا جو برا حال تھا، اس کا ذکر اپنے ان چند اشعار میں کرتے ہیں

(نسخہ حمیدیہ ۳۳۷، غالب از مولانا غلام رسول مہر، دوسرا اڈیشن ص ۳۰۸)

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا — وہی رونا تن و دل وجاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے — سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

پھر اپنے مختلف خطوط میں دلی کی تباہی اور بربادی پر برابر آنسو بہاتے رہے اور

اس کا غم ان کی زندگی کے آخری لمحات تک رہا، ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس کے محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا، واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ آباد ہوگئے ہیں، اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے، راجہ صاحب نے صاحبان عالیشان (یعنی انگریزوں) سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں، چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے، مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگامہ میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں، میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا، اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا، میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں

یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی، غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آئے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے، کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں، بلکہ ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں، دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے، یہاں باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا"۔

(مورخہ ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء، بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

دہلی کی بربادی کا ایک دوسرا نقشہ ۲۳ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں بھی پیش کرتے ہیں، جس میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کا بھی ضمناً ذکر دبے الفاظ میں آگیا ہے؛

"چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا، بلی ماروں کے دروازہ کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر جوڑا کر لیا، شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں، تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے، بادشاہ، میرزا جواں بخت میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے، اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی، دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں، خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء

میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے، خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے، اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔"

(مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء بنام سرفراز حسین)

انگریزوں نے دلی کے خاص خاص حصوں میں پھاوڑے چلائے، ان کا ذکر غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے جیسے ان کے قلب پر پھاوڑا چلا ہے۔

"شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے، پون ٹوٹی (یعنی ٹون ڈیوٹی بمعنی چنگی) کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے، سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر محصول نہ لگا ہو، جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، دارالبقا (مفتی صدر الدین آزردہ کی درسگاہ) فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کی بڑ تک ڈہے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے، باقی خیر و عافیت ہے۔" (مورخہ ۹ نومبر ۱۸۵۹ء خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، جلد اول ص ۳۲۰)

دہلی کا ماضی یاد آجاتا ہے تو اس طرح روتے ہیں:

"اے اب اہل دہلی ہندو یا اہل حرفہ ہیں، یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، یا گورے، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پروا ہوا اب کہاں، وہ لطف تو اسی مکان میں تھا، اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے، بہر حال می گزرد، مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں

بند ہو گیا، لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے، خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے، پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے، یاد کرو، مرزا گوہر کے باغچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا، پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا، قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے، اور پانی گوہر نایاب ہو گیا، تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا، اللہ اللہ، دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے، واہ رے حسن اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔" (۱۸۶۱ء، خطوط بنام غالب جلد اول، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۳۳۳ - ۳۳۲)

ایک اور خط مورخہ ۱۸۶۲ء میں دہلی مرحوم کا ذکر کر کے بری طرح دل فگار ہوتے ہیں، دلی، بادشاہ، امرا، احباب، علما، صلحا، قلعہ، جھجر، بہادر گڑھ اور بلب گڑھ فرخ نگر

وغیرہ ریاستوں کی بربادی پر دردانگیز طریقہ پر نوحہ خوانی کی ہے۔

"اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے، مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السلف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے پاتے ہیں، اناث میں جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں، امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا، میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا، آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار، مرگیا، تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی، احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا اس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے، بڈھے صاحب ساری املاک کو بیچکر نوش جان کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کی کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش بیس لاکھ روپئے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں

خاک میں مل گئیں، ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے، جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے، صلحا، اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔" (خط بنام علاء الدین احمد خاں علائی، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۴۰۔ ۳۸)

لکھنؤ کی تباہی سے بھی ان کو بڑا دکھ ہوا، اور اپنے ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:۔

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے، خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی، امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔"

(خطوط غالب جلد اول ص ۲۴۲)

ان کی وطن دوستی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ان کو اپنے ہم وطن ہندوؤں سے وہی جذباتی ہم آہنگی رہی، جس کے نشو و نما کے لیے موجودہ ہندوستان طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہے، غالب اپنے ہندو ہموطنوں کے خیالات و عقائد کا احترام کرتے رہے، جیسا کہ ان کی مثنوی چراغ دیر سے ظاہر ہے، اور ان ہی کے قلوب کی تسخیر کی خاطر بنارس کو ہندوستان کا کعبہ بھی قرار دیا ہے،

عبادت خانۂ ناقوسیانست   ہمانا کعبۂ ہندوستانست

اور پھر یہاں کے بتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی اصل کوہ طور کے شعلے سے اور وہ ایزد تعالےٰ کے سراپا نور ہیں، اس سے صرف غالب کے شاعرانہ خیالات

کا اندازہ کیجئے، عقیدہ کو ابھی بحث میں نہ لائیے۔

بنازش را ہیولی شعلۂ طور سراپا نور ایزد چشم بد دور

اس شہر کے لالہ زار بیابان در بیابان ہیں اور اس کی نو بہار گلستان در گلستان ہے'

بیابان در بیابان لالہ زارش گلستان در گلستان نو بہارش

کہتے ہیں کہ آواگون کے ماننے والے کاشی کی تعریف کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ جو کوئی اس گلشن میں مرتا ہے، اس کا ملاپ دوبارہ جسم سے نہیں ہوتا، یعنی پھر آواگون کے ماتحت ہو کر زندہ نہیں ہوتا ہے، وہ یہاں مرنے کے بعد زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد دگر پیوند جسمانی نگیرد

چمن سرمایۂ امید گردد بمردن زندۂ جاوید گردد

اور پھر غالب کو اپنے ہندو شاگردوں، دوستوں اور ہم وطنوں سے جو محبت رہی وہ اپنی مثال آپ ہے، اس میں بھی جذباتی ہم آہنگی کی شفق پھولی ہوئی نظر آتی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ سے ان کا اخلاص ضرب المثل رہا، وہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے، غالب سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے، لیکن انھوں نے غالب کو اپنا استاد تسلیم کر لیا تھا، پچاس ہزار اشعار کے مالک تھے، انکے نام جتنے خطوط ان کے مجموعوں میں ہیں کسی اور کے نام نہیں، ان میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے اقتباسات سے ان کی محبت کا اندازہ ہوگا، ان میں ان کو کبھی مہاراج، کبھی بھائی، کبھی شفیق بالتحقیق، کبھی بندہ پرور، صاحب منشی صاحب، جان من

و جانانِ من، مرزا تفتہ، مشفق میرے، کرم فرما میرے، میری جان وغیرہ کے القاب سے مخاطب کرتے،

"مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا، دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا، لیکن ناخوش بھی نہ رہا، بہرحال مجھکو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ (جلد اول ص ۱۰۱)

"یاد رہے یہ نکات سوائے تمھارے اور کو میں نہیں بتاتا"۔ (ص ۱۲۷)

تمھاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں، تم کو یوں ہی چاہئے تھا (۱۸۵۸ء ص ۱۳۹)

سچ کہتا ہوں کہ تمھارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ (مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء ص ۱۷۲)

"قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا، آفریں ہے (مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے، اور بد گمانی، معاذ اللہ تم سے اور آزردگی، مجھکو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے، تم ایسی کونسی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو، رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا، وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا، اور اس سے زیادہ آزردہ ہوتا، بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے، برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی، تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں،

معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی، خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔" (مورخہ ۲۷ نومبر ۱۸۶۳ء، جلد اول ص ۱۹۷)

آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو، یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا، پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا تھا، پھر خط صاحب نے اب مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا، دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی آن پہنچیں، صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے معتقد ہیں، کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو، فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے، باقی بالخیر شما سلامت۔

تفتہ کو بھی غالب سے بڑی محبت رہی، وہ موقع بموقع ان کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے، ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے میں ان کی ہر طرح خبر گیری کی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا، غالب کی وفات ہوئی تو ان کی وفات پر یہ قطعہ لکھا، جس میں ان سے ان کی پوری عقیدت و محبت کا اظہار ہے،

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے — ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض کمال و صدق و صفا و حسن و عشق — چھ لفظ اسکے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

۱۸۵۷ء کے پر آشوب ہنگامے کے زمانہ میں بڑی نفسا نفسی رہی، پہلے تو ہندو اور مسلمان مل کر انگریزوں سے بر سر پیکار ہوئے، لیکن واقعات کا رخ کچھ ایسا پلٹا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا، جس سے انگریزوں کو اپنی حکومت پھر سے جمانے میں پوری مدد مل گئی،

ان تمام ہنگاموں کی تفصیل بیان کرنے میں غالب نے دستنبو میں اچھے ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر خیر بڑی فراخ دلی سے کیا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ ان میں وطنی رواداری اور وطنی محبت بہت ہی جاگزیں ہو گئی تھی، وہ اس ابتلا و آزمائش کے زمانہ میں پٹیالہ کے مہاراجہ نرندر سنگھ کے بڑے معترف اور ممنون رہے، اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا علاقہ ان ہی کی بروقت امداد سے محفوظ رہا، دستنبو میں لکھتے ہیں،

اس ابتلا میں کشایش کی ایک صورت ظہور پذیر ہوئی تفصیل یہ ہے کہ خورشید شکوہ، کیواں جاہ، مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرمانروائے پٹیالہ اس لڑائی میں فاتحین (یعنی انگریزوں) کے ساتھ ہیں، ان کی فوج ابتدا سے انگریزی فوج کی ہمراہی میں ہے، راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں بلند رتبہ اور شہر کے ممتاز رئیس ہیں، مثلاً حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں، حکیم غلام اللہ خاں، کہ خلد آشیاں حکیم شریف خاں کی اولاد میں ہیں، اس گلی میں رہتے ہیں. آستاں در آستاں، اور بام در بام، دور تک ان کی دو رویہ عمارتیں ہیں، راقم الحروف دس سال سے ان صاحبان ثروت میں سے ایک کا ہمسایہ ہے، ان تین میں سے اول الذکر اہل و عیال کے ساتھ اپنی خاندانی روایت کے مطابق شہر میں عزت مندانہ بسر کرتے ہیں، اور دوسرے دو پٹیالہ میں راجہ کی ہمدمی و ہم نشینی سے بہرہ ور ہیں، چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے از راہ بندہ پروری نبرد آرا زور آزماؤں سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب مساعدت وقت سے ظفر یاب ہوں، اس گلی کے دروازے پر محافظ بٹھا دیں، تاکہ انگریز فوجیں جنھیں گورا کہا جاتا ہے، گلی کو نقصان نہ پہنچائیں، ..... تیسرے روز مہاراجہ کے سپاہی آئے،

پہرہ بیٹھ گیا اور گلی والوں نے لیٹروں کے گھس آنے کے خوف سے نجات پائی۔"

ہندوؤں میں مہیش داس، ہیرا سنگھ، شیوجی رام برہمن اور مرزا ہرگوپال تفتہ نے مسلمانوں اور خود ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کا ذکر بھی بڑے امتنان و تشکر کے ساتھ کرتے ہیں، لکھتے ہیں:-

"میں سخت قلاش، اگر خدا دوست، خدا شناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس گنّے کی دیسی شراب بھیجکر جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا، تو میں زندہ نہ رہ سکتا، اور جگر تشنگی کی شدت سے دم توڑ دیتا...... دانش مند مہیش داس نے مجھے وہ آب حیات بخشا جسے سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھرا تھا، انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا، جو دیکھا ہے، بن کہے نہیں چھوڑا جا سکتا، اس نیک طینت نے شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، چونکہ سرنوشت آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی، کام بننا مشکل ہوگیا، ہندوؤں کی آزادی اور آبادی سب جانتے ہیں، کہ مہربان حاکموں کی مہربانی کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس خیر پسند خیر گزیں کی خیر خواہی اور کارسازی کا اس انتظام میں دخل رہا ہے، مختصر قصہ ایک نیک بخت آدمی ہے، لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والا، ناے و نوش کے ساتھ اچھی زندگی گزارنے والا، اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے اور کبھی کوئی تحفہ بھیجکر مجھے احسان مند کرتا ہے اور داد مہربانی دیتا ہے۔

میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں ایک ہیرا سنگھ ہے، وہ ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، میرے پاس برابر آتا اور میرا غم غلط کرتا ہے،

اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیوجی برہمن بھی ہے جو ایک جوان، دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دل ریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے، اور اپنی بساط کے بقدر میری فرمانبرداری کرتا اور میرے کام بناتا ہے، اس کا بیٹا بال مکند بھی ایک نیک طینت اور پرہیزگار نوجوان ہے، اپنے باپ کی طرح میری فرمانبرداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔

دور دست دوستوں میں آسمان مہر و مروت کا وہ ماہ کامل شیوا زبان ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے، اور چونکہ شاعری میں مجھے اپنا استاد کہتا ہے، اس کا کلام جملہ خدا داد ہے، مجسم محبت اور سراپا مہربانی، شاعری اس کے فروغ کا باعث اور اس سے شاعری کا ہنگامہ گرم، فرطِ محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے، اور میرزا تفتہ خطاب دیا ہے، اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی مجھے بھیجی ہے، اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے، یہ باتیں جن کا بیان لازمی نہیں تھا، میں نے خاص طور پر اس لیے بیان کیں کہ شکر محبت و انسانیت ادا ہو جائے اور جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھ میں پہنچے وہ جان لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے، راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن کو دیواروں کے روزن روشنی سے تہی، غالب شہر آشنا، ہزار دوست، جو ہر گھر میں کوئی دوست اور ہر مکان میں کوئی شناسا رکھتا تھا، اب اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی ہمنوا اور سائے کے سوا کوئی ساتھی نہیں...... اگر شہر میں یہ چار دن آدمی نہ ہوتے تو میری بیکسی کا گواہ بھی کوئی نہ ہوتا۔"

(دستنبو کا یہ اردو ترجمہ مارچ ۱۹۶۹ء کے رسالہ تحریک سے لیا گیا ہے)

غالب منشی شیونرائن آرام کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے، وہ آگرہ کے ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ ان کے پردادا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے ساتھی تھے، ان کے دادا منشی بنسی دھر غالب کے دوستوں میں تھے۔ ان کے والد منشی نند لال بھی بارسوخ آدمی تھے۔ غالب نے ان خاندانی تعلقات کا لحاظ بہت اچھی طرح کیا۔ منشی شیونرائن آرام نے آگرہ میں ایک مطبع کھول رکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت کرتے وقت غالب انکو مہاراج، نورِ بصر، لختِ جگر، برخوردار، اقبال نشان، برخوردار کامگار، میری جان وغیرہ لکھتے ہیں، ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

"برخوردار، منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو، جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو، اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار، تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم، مجھ سے سنو۔

تمہارے دادا کے والد عہد تخت خان ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیٹھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں، میں اور وہ ہم عمر، شاید بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت

آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے، بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے، ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی، اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا، اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔" (خطوط غالب جلد اول۔ ص ۵۸-۲۵۷)

ایک اور خط میں غالب ان کو لکھتے ہیں:۔

میاں، میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں، خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے، تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ (جلد اول ص ۲۷۳)

غالب جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ سے بھی اپنے بچوں کی طرح محبت رکھتے تھے، یہ دونوں سگے بھائی تھے انگریزوں کی حکومت میں تحصیلدار اور نائب تحصیلدار تھے، جواہر سنگھ جوہر فارسی میں اشعار لکھکر غالب سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے، ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ (مطابق ۶۱-۱۸۶۰ء) میں ہوا تو غالب نے ان کے لیے حسب ذیل تاریخ وفات کہی:۔

گو بندرائے چھجمل شیریں کلام مرد — دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے زسال وفاتش نشاں دہد — غالب شنید و گفت چہ گویم بیا دریغ
۱۲۷۷

غالب نے اپنی ایک رباعی میں بھی ان کا ذکر کیا ہے:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم — شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

قاطع برہان کے تنازعہ میں جوہر غالب کے ساتھ تھے، جب یہ کتاب لکھی گئی تو اسکی تاریخ اس طرح کہی

این نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست — تالیف حریف غالب دوراں ہست
جوہر ایں گفت سال طبعش طبعم — زیبا فرہنگ قاطع برہان ہست
۱۲۷۸

اوپر ذکر آیا ہے کہ غدر کے ہنگامہ میں ہیرا سنگھ غالب کے ساتھ سایہ بن کر رہے، دہلی کے منشی بہاری لال مشتاق (المتوفی ۱۹۰۵ء) سے بھی غالب کو بڑا لگاؤ رہا، غالب ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

مجھکو تم سے جو محبت ہے اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمھارے خال فرخ فال مکند لال میرے بڑے پرانے یار ہیں، خوش خو، شگفتہ رو، بذلہ گو، دوسرے تمھاری سعادتمندی اور خوبی اور حلم اور بقدر حال علم، اردو نظم و نثر میں تمھاری طبیعت کی روانی اور تمھارے قلم کی گل فشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے، بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، میں تم کو جابجا آگاہ کرتا رہتا ہوں"۔ (جلد دوم ص ۳۳۷)

رائے بہادر پیارے لال آشوب کو بھی غالب بہت عزیز رکھتے تھے، انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی، محکمۂ تعلیم کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے، ۱۸۶۶ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے دہلی میں دربار کیا، تو غالب کا آخری زمانہ تھا، بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس میں رائے بہادر پیارے لال آشوب بھی غالب کے پاس ہی بیٹھے تھے، غالب لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کے لیے اٹھے تو رائے بہادر سہارا دینے کیلئے

ساتھ ہو گئے، لفٹنٹ گورنر نے غالب سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کا لڑکا ہے، غالب نے جواب دیا نہیں مگر لڑکے سے زیادہ ہے۔ (خطوط غالب جلد دوم ص ۱۹ - ۳۱۸)

غالب کے ہندو دوستوں میں ہرگوبند سنگھ، رائے امید سنگھ، بلوان سنگھ، بال مکند، گوبند سہائے، منشی نولکشور، اور خدا جانے کتنے اور تھے، ان سب کا ذکر اپنے خطوط میں بہت ہی محبت و شفقت سے کرتے ہیں،

غالب نے اپنی رواداری، بے تعصبی اور اپنے ہندو دوستوں اور شاگردوں سے محبت و اخلاص کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں آج ہزاروں غالب اور ان کے ساتھ لاکھوں ہرگوپال تفتہ، شیو نرائن آرام، ہیرا سنگھ، جواہر سنگھ اور پیارے لال آشوب پیدا ہو جائیں تو پھر اس ملک میں بھی وہی جذباتی ہم آہنگی، وہی باہمی اتحاد، وہی مکمل یکجہتی اور وہی وطنی موانست پیدا ہو جائے، جس سے ملک آگے اور بہت آگے بڑھتا رہتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

(۵)

علامہ فیروز آبادی صاحب القاموس

نام ونسب محمد نام، ابو طاہر کنیت اور مجد الدین لقب تھا، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے:
محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ بن الشیخ ابی اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف بن عبداللہ بن السراج ابی یوسف بن الصدر ابی اسحاق بن الحسام بن السراج[1] فیروز آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، یہ مقام شیراز کا ایک نواحی قریہ ہے، جسے شاہ فارس فیروز نے بسایا تھا،[2] علامہ مجد الدین کے آباء واجداد وہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو بھی اسی طرف منسوب کیا جاتا ہے، ورنہ انکی پیدائش کازرون نامی ایک دوسرے شہر میں ہوئی تھی،

ولادت ماہ ربیع الآخر ۷۲۹ھ میں کازرون میں متولد ہوئے،[3] جو شہر بحرین اور شیراز کے درمیان واقع ہے، جسے عضد الدولہ بن بویہ نے بسایا تھا، اس کی مردم خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل علم کی ایک بڑی جماعت کو اس کی طرف انتساب کا شرف حاصل ہے، متاخرین علماء میں ابو العباس احمد بن منصور کازرونی (المتوفی ۵۸۶ھ) اور

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، [2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰ [3] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۸ [4] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۷۹

صوفی ابو الحسین بن ابی علی الکازرونی (المتوفی ۵۵۳ھ) کے نام لائق ذکر ہیں،[4] علامہ مجد الدین بھی اسی معدن کے گوہر آبدار تھے۔

تحصیل علم علامہ فیروز آبادی نے اپنے مولد کازرون ہی میں نشوونما پائی اور وہیں تحصیل علم کا آغاز کیا، اس وقت کے عام دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا صرف سات سال کی عمر میں اس دولت سے بہرہ ور ہوئے، پھر شیراز منتقل ہو گئے، اور وہاں اپنے والد بزرگوار کے علاوہ عبداللہ بن محمود بن النجم اور ابو عبداللہ محمد بن یوسف الانصاری وغیرہ شیراز کے دوسرے اہل علم سے حدیث، ادب اور لغت کی تعلیم حاصل کی۔

تحصیل علم میں ان کے انہماک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صحیح بخاری کا سماع انھوں نے علامہ زرندی، علامہ قزوینی، فارقی، شیخ عز بن الحموی، مسعودی، قلقشندی اور حافظ علائی سات شیوخ سے کیا، اول الذکر سے سماع بخاری کے علاوہ جامع ترمذی کو بھی سبقاً سبقاً پڑھا، ناصر الدین محمد بن ابی القاسم الفارقی سے رمضان ۷۵۵ھ میں جامع ازہر میں صحیح بخاری کی سماعت کی، صحیح مسلم کو بیت المقدس میں علامہ بیانی سے ۲ نشستوں میں اور امام محمد بن جہبل سے دمشق میں تین روز میں پڑھا، انکے علاوہ ابن الخباز، عز بن جماعۃ، نجم عبد الرحیم البارزی، محمد بن عبد المعطی سے بھی مسلم کا سماع کیا، سنن ابی داؤد کو ابو حفص عمر بن عثمان اور ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد سے سنا سنن ابن ماجہ کی سماعت بعلبک میں ابو الفضائل عبد الملک، عبد الکریم اور عز بن مظفر سے کی۔[2]

علمی سفر انھوں نے تحصیل علم کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا، سب سے پہلے عراق کا قصد کیا،

[1] معجم البلدان ج ۷، ص ۲۰۶ [2] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰-۸۱

اور واسط میں احمد بن علی الدیوزی سے قرات عشرہ میں مہارت پیدا کی، پھر بغداد گئے اور وہاں تاج محمد بن السباک اور عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصراللہ ابن محمد الکنبتی اور قاضی بغداد عبداللہ بن بکتاش سے کسب فیض کیا، علامہ قزوینی سے صحیح بخاری کے سماع کے علاوہ صغانی کی مشارق الانوار بھی پڑھی۔

اس کے بعد ۷۵۵ھ میں دمشق آئے اور یہاں کے سو سے زیادہ شیوخ سے علم کی تحصیل کی، پھر حماۃ، حلب اور قدس کا سفر کیا، قدس میں تقریباً بیس سال تک افادہ واستفادہ میں مشغول رہے، پھر غزہ ورملہ ہوتے ہوئے سرزمین قاہرہ میں قدم رکھا اور وہاں کے کبار علماء سے اپنے ذہن ودماغ کو مالامال کرنے کے بعد یمن، روم اور ہندوستان کے بھی علمی سفر کیے[1]۔

اساتذہ اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا کہ علامہ فیروزآبادی نے شیراز کے علاوہ مختلف ممالک کے ائمۂ فن کے خرمن فضل وکمال سے خوشہ چینی کی تھی، اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ممتاز اور نمایاں شیوخ میں لائق ذکر نام یہ ہیں:

عبداللہ بن محمود بن النجم، محمد بن یوسف الزرندی، احمد بن علی الدیوانی، تاج محمد السباک، عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصراللہ بن محمد الکنبتی، عبداللہ بن بکتاش، تقی السبکی، ابن الخباز، ابن القیم، محمد بن اسمٰعیل الحموی، احمد بن عبدالرحمٰن المرداوی، احمد بن مظفر النابلسی، یحییٰ بن علی الحنفی، بہار بن عقیل، جمال الاسنوی، ابن ہشام، عز بن جماعہ، مظفر العطار، ناصر الدین التونسی، ناصر الدین الفارقی، ابن نباتہ، احمد بن محمد الجزائری، خلیل المالکی، تقی الحرازی، نور الدین القسطلانی، نجیب الحرانی، ابن عبدالدائم، شرف الدمیاطی، اسماعیل، قلقشندی،

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱

حافظ ابی سعید العلائی، محمد بن احمد بن عبدالمعطی، ابوحفص عمر بن عثمان، ابواسحٰق ابراہیم ابن محمد، ابومحمد بن البارزی، ابوالفضائل عبدالکریم، عمر بن المظفر، حمزہ بن محمد[1]۔

تلامذہ انھوں نے اگرچہ کسی مقام پر مستقل مجلسِ درس آراستہ نہیں کی، اور علم کی تشنگی نے انھیں عمر بھر جہاں گردی میں مصروف رکھا، لیکن ان کی علمی جلالت کی بنا پر جہاں کہیں بھی ہو گئے وارفتگان علم اس کے گرد جمع ہو گئے، اور ان سے مستفیض ہوئے، علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:-

کثر الآخذون عنہ وتلمذ
لہ جماعۃ من الاکابر[2]

ان سے تحصیل علم کرنے والوں کی تعداد بکثرت ہے، اکابر علماء بھی ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں۔

اس بیان سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہے، لیکن تلامذہ کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں ملتا، صرف ذیل کے چند نام منتشر طور پر ملتے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی، تقی الفاسی مقریزی، صلاح الصفدی، جمال بن ظہیرہ اور برہان الحلبی۔

تبحر علمی یوں تو انھیں تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ تمام ہی علوم میں کامل دسترس تھی، لیکن فن لغت سے ابتدا ہی سے خصوصی شغف رکھتے تھے اور آٹھ سال کی عمر سے اس کے حصول میں غیر معمولی محنت شروع کر دی تھی، اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ادیب اور لغوی ان کے نام کا جزو بن گئے، فاسی کا بیان ہے:

لہ تحصیل فی فنون من العلم

انھوں نے مختلف علوم وفنون کی تحصیل

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ [2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰

سیما اللغۃ فلہ فیھا الید الطولی[۱]
والف فیھا توالیف حسنۃ

کی تھی، بالخصوص لغت میں وہ یدطولی رکھتے تھے، اس میں انھوں نے بہترین کتابیں تالیف کیں،

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :-

نظر فی اللغۃ فکانت جل قصدہ
فی التحصیل فمھر فیھا الی ان بھر
وفاق[۲]

لغت میں انھوں نے خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا اور اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ سب سے گوئے سبقت لے گئے۔

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں :-

امام عصرہ فی اللغۃ .....

وہ لغت میں امام دوراں تھے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

اما معرفتہ باللغۃ واطلاعہ
علی نوادرھا فامرہ مستفیض[۳]

لغت میں انکی معرفت اور اسکے نوادر و نکات سے انکی واقفیت مشہور ہے۔

ذوق شعر وسخن ادب ولغت سے شغف کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ شعر وسخن کا بھی نکھرا ذوق رکھتے تھے، نثر بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی لکھتے تھے، ان کی بعض نگارشات ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہیں، تقی الدین الکرمانی کا بیان ہے کہ

الشیخ مجد الدین الفیروزآبادی
عدیم النظیر فی زمانہ نظماً
ونثراً بالفارسی والعربی

شیخ مجد الدین فیروزآبادی اپنے زمانہ میں فارسی وعربی نظم ونثر میں عدیم النظیر تھے۔

۱؎ الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ ۲؎ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷ ۳؎ مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۳ و ۱۰۴

فاسی کہتے ہیں :

ولہ شعر کثیر ونثرہ اعلیٰ[۱]

انکے بکثرت اشعار ہیں، انکی نثر بھی عمدہ ہوتی تھی۔

علامہ شوکانی اور حافظ سخاوی نے سلطان اشرف کے نام ان کا ایک مکتوب نقل کیا ہے، جو ان کے بلند ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے[۲]

منصب قضا ایک مرتبہ علمی سیاحت کے دوران میں وہ رمضان ۷۹۶ھ میں یمن کے مشہور شہر زبید پہنچے، اس زمانہ میں یہاں کے قاضی القضاۃ جمال الریمی شارح التنبیہ کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے سلطان اشرف اسمٰعیل نے علامہ فیروزآبادی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے اعزاز واکرام سے ان کو زبید میں رکھا، اور ایک ہزار دینار عطا کیے، پھر ایک سال دو مہینہ کے بعد ۷۹۷ھ میں انھیں پورے یمن کا قاضی مقرر کیا، اور وہ تا حیات وہاں اس منصب پر فائز رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے سلطان اشرف کے بعد اس کے لڑکے سلطان ناصر کا عہد حکومت بھی دیکھا،[۳]

سلاطین وقت سے روابط ان کی علمی جلالت کا سکہ امراء وسلاطین کے دلوں پر بھی نقش تھا، وہ جس ملک میں بھی پہنچے، وہاں کے حاکم نے انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے ملک میں ان کا قیام مایۂ افتخار تصور کیا، حافظ سخاوی رقمطراز ہیں :-

ولم یقدم لہ قط انہ دخل
بلداً الا واکرمہ متولیھا
وبالغ[۴]

جس شہر میں بھی وہ گئے وہاں کے حاکم نے ان کا غایت درجہ اکرام و اعزاز کیا۔

اس لیے بہت سے امراء وسلاطین سے ان کے روابط رہے، علامہ شوکانی کا

۱؎ روضات الجنات ج ۸ ص ۲۰۷-۲۰۸ ۲؎ البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱ ۳؎ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، ۴؎ الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰

بیان ہے "کان مقبولاً عند السلاطین"[1] شاہ منصور بن شجاع والی تبریز، سلطان اشرف والی مصر، ابن عثمان شاہ روم، احمد بن اویس حاکم بغداد، سلطان اشرف والی یمن، اور تیمور لنگ وغیرہ نے ان کو وقتاً فوقتاً بیش قیمت نذرانے و تحایف پیش کیے، سلطان اشرف نے ان کا اتنا اعزاز کیا کہ ان کو یمن کا قاضی القضاۃ بنانے کے علاوہ ان کی صاحبزادی سے شادی کرکے ان سے عزیزانہ تعلق بھی پیدا کرلیا،

مالی خوشحالی

طاش کبری زادہ کا بیان ہے کہ فیروز آبادی روم گئے تو وہاں کے حکمراں ابن عثمان نے ان کو بہت سامال دیا[2]، علامہ سیوطی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ فیروزآبادی نے ملک اسماعیل کے لیے ایک کتاب لکھی، اور اس کو طباق میں رکھکر بادشاہ کو پیش کیا، اس نے وہ طباق سونے سے بھردیا[3]، صاحب روضات تسطراز ہیں کہ

اجتمع بتیمور لنگ فنظمه	وہ تیمور لنگ سے ملے تو اس نے انکا
وانعم علیه بمائة الف درهم[4]	اکرام کرنے کے ساتھ ایک لاکھ درہم بھی دیے

سلاطین و امرا کی اس داد و دہش سے ان کو ہمیشہ بڑی فراغت حاصل رہی،

کتابوں سے شغف

اس دولت کا بڑا حصہ وہ اپنے تعیش کے بجائے کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے، علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

وصل الیه من عطایاهم[5] شیئ کثیر فاقتنی من ذالك کتباً نفیسة	امرا سے ان کو بہت عطیے ملے انھوں نے اس سے قیمتی کتابیں خرید لیں.

ان کا خود بیان ہے.

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰ [2] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۴ [3] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۱ [4] روضات الجنات ج ۴ ص ۴۰۴ [5] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱

اشتریت بخمسین الف مثقال ذهبا کتبا[1]	میں نے کتابوں کی خریداری پر پچاس ہزار مثقال سونا صرف کیا،

ان کو مطالعہ سے اتنا شغف تھا کہ سفر میں بھی متعدد اونٹوں پر کتابیں بار کرکے ساتھ لیجاتے تھے، اور جہاں پڑاؤ ہوتا نکال کر مطالعہ کرتے، کتابوں کی خریداری اور حاجتمندوں کی حاجت برآری میں وہ اس قدر صرف کرتے تھے کہ بعض اوقات اپنی ضرورت کے لیے کتابوں کو فروخت کرنے کی نوبت آجاتی تھی اس فیاضی کا نتیجہ یہ تھا کہ وفات کے وقت انھوں نے کوئی اندوختہ نہ چھوڑا، سخاوی کا بیان ہے:

کان لا یسافر الا وصحبته منها	وہ جب بھی سفر کرتے متعدد بار شتر کتابیں
عدة احمال کتب ویخرج اکثرها	ساتھ لیجاتے اور جہاں منزل ہوتی ان کو
فی کل منزل له فینظر فیها ویعیدها	نکال کر پڑھتے اور روانگی کے وقت پھر انہی
اذا ارتحل وکذا کانت له دنیا طائلة	میں رکھدیتے، انھیں بکثرت دولت دنیا
ولکنه کان یدفعها الی من یمحقها	ملی لیکن انھوں نے اس کو اس اسراف
بالاسراف فی صرفها بحیث	سے صرف کیا کہ کبھی کبھی ان کو اتنی تنگی ہوجاتی
یملق احیانا ویحتاج لبیع بعض	تھی کہ بعض کتابوں کے بیچنے تک کی نوبت
کتبه فلذلك لم یوجد له	آجاتی تھی، اسی لیے ان کی وفات کے بعد
بعد وفاته ما کان یظن به[2]	کوئی قابل ذکر اندوختہ نہیں ملا،

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں:

حصل له دنیا طائلة ومع ذلك	انھیں بہت زیادہ دولت دنیا ملی، اسکے

---

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۹ [2] ایضاً ج ۱۰ ص ۸۱

انہ کان قلیل المال لسعۃ نفقاً[۱] باوجود مصارف کی کثرت کی وجہ سے

ان کے پاس بہت کم رہتا تھا۔

سرعت کتابت اور قوت حافظہ حافظہ نہایت قوی تھا، عمدہ اشعار بکثرت یاد تھے، بہت خوش تحریر اور سریع القلم تھے، روزانہ شب میں سونے سے قبل دو سو سطریں زبانی یاد کرنا ان کا معمول تھا، حافظ سیوطی نقل کرتے ہیں کہ

کان یقول ماکنت انام حتی احفظ مائتی سطر[۲] وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک میں دو سو سطریں حفظ نہیں کرلیتا سوتا نہیں۔

مکہ سے والہانہ تعلق مکہ مکرمہ سے انھیں بڑا قلبی لگاؤ تھا۔ اس مبارک سرزمین کی کشش انھیں بار بار اپنی طرف کھینچتی رہی، پہلی مرتبہ ۷۶۰ھ میں اور دوسری بار ۷۷۰ھ میں مکہ گئے، اس مرتبہ ۵-۷ سال مسلسل قیام رہا، پھر متعدد مرتبہ اس کی زیارت اور طویل مدت تک قیام کی سعادت حاصل کی، مکہ سے ان کو اتنا عشق تھا کہ عمر بھر اسی سرزمین میں جان دینے کی تمنا کرتے رہے، لیکن خدا کی مشیت کچھ اور تھی، اس لیے زبید کی خاک کا پیوند ہوئے۔

وفات نصف صدی سے زیادہ ضیا باری کے بعد علم و دانش کا یہ آفتاب ۲۰ شوال ۸۱۷ھ کو بمقام زبید غروب ہوا، وفات کے وقت ۹۰ سال سے زائد عمر ہو چکی تھی، شیخ اسماعیل الجبرتی کی تربت کے قریب دفن ہوئے[۳]۔

تصانیف ان کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بیان کی جاتی ہے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ اور لغت ہر فن کی کتابیں شامل ہیں، طاش کبری زادہ رقمطراز ہیں:

ومصنفاتہ کثیرۃ وقد عد منھا ان کی تصنیفات بکثرت ہیں، چالیس سے

۱؎ مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۴۔ ۲؎ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷۔ ۳؎ ایضاً ص ۱۱۸

بضع واربعون مصنفاً زائد شمار کی گئی ہیں،

جن کتابوں کے نام مل سکے وہ حسب ذیل ہیں:

اللامع المعلم العجاب، القاموس المحیط، فتح الباری، لطائف ذوی التمییز (کئی جلد) تنویر المقباس (چار جلد) تیسیر فاتحۃ الایاب فی تفسیر فاتحۃ الکتاب، الدر النظیم، حاصل کورۃ الخلاص فی فضائل سورۃ الاخلاص، تطبۃ الخشاف فی شرح خطبۃ الکشاف، شوارق الغلبیہ فی شرح مشارق الانوار، عمدۃ الحکام، امتضاض السہاد فی افتراض الجہاد، الاسعاد بالاصعاد (تین جلد) المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ، البلغۃ فی تراجم ائمۃ النحو واللغۃ (اس کا ۱۲۹۳ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے، تعداد صفحات ۸۰) الفضل الوفی فی عدل الاشرفی، نزہۃ الاذہان فی تاریخ اصبہان، تسہیل طریق الفصول فی الاحادیث الزائدۃ علی جامع الاصول، الاحادیث الضعیفہ، الدر الغالی فی الاحادیث العوالی، سفر السعادۃ، المتفق وضعاً والمختلف صقعاً، المقصود لذوی الالباب، تحبیر الموشین، المثلث الکبیر (پانچ جلد) الروض المسلوب النفحۃ العنبریہ فی مولد خیر البریہ، روضۃ الناظر فی ترجمۃ الشیخ عبدالقادر، منیۃ السول فی دعوات الرسول، الدرر المبثثۃ فی الغرر المثلثۃ، بلاغ التلقین، اسماء السراح فی اسماء النکاح، اسماء الغادہ فی اسماء العادہ، الجلیس الانیس فی اسماء الخندریس، انواء الغیث فی اسماء اللیث۔

ان میں سے بیشتر کتابیں غیر مطبوعہ اور معدوم ہیں، مشہور تصانیف کا تعارف ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

۱۔ اللامع المعلم العجاب الجامع المحکم العباب۔ یہ فن لغت میں ان کی سب سے مبسوط

اور ضخیم تصنیف ہے جو اس کتاب کو سو جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور ہر جلد ضخامت میں صحاح جوہری کے برابر پیش نظر تھی، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی سخاوی کا بیان ہے کہ "میں نے اس کتاب کی پانچ جلدیں مصنف کے خط کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔"[1] یہ کتاب ۶۰ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی،[2] جیسا کہ القاموس کے آغاز میں خود مصنف نے تصریح کی ہے،

۲۔ **القاموس المحیط**۔ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل، یہ کتاب علامہ فیروز آبادی کا وہ عظیم کارنامہ ہے، جس نے انھیں تاریخ میں لازوال شہرت عطا کی ہے، اور صاحب القاموس ان کے نام کا جزو ہو گیا، اسکی تکمیل مکہ میں کوہ صفا پر کی تھی، جیسا کہ کتاب کے آخر میں مصنف نے خود لکھا ہے،

قد یسّر اللہ اتمامہ علی	اللہ تعالیٰ نے اس کی تکمیل مکہ میں کعبہ
الصفا بمکۃ المشرفۃ تجاہ	کے سامنے کوہ صفا پر کرنے کی توفیق
الکعبۃ المعظمۃ[3]	عطا فرمائی۔

یہ کتاب درحقیقت اللامع المعلم العجاب کی تلخیص ہے، اس کے سبب تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

کنت برھۃ من الدھر التمس	میں ایک زمانہ تک ایک جامع وبسوط
کتابا جامعاً بسیطاً	کتاب کی تلاش میں رہا...... اور جب
ولما اعیانی الطلاب شرعت	طلبہ نے بیحد اصرار کیا تو میں نے اللامع المعلم
فی کتابی الموسوم باللامع المعلم	العجاب الجامع بین المحکم والعباب کے

العجاب الجامع بین المحکم	کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی....
والعباب وھما غرتا الکتب	مگر وہ ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی،
المصنفۃ فی ھذا الباب....	جس کی تحصیل طلبہ کے لیے بڑی دشوار
غیر انی ختمتہ فی ستین سفراً	طلب تھی، اس لیے مجھ سے اسی قسم کی
یعجز تحصیلہ الطلاب سئلت	ایک مختصر کتاب لکھنے کی خواہش کی گئی
تقدیم کتاب وجیز علی ذلک	.....چنانچہ میں نے یہ کتاب تالیف
النظام..... فالفت ھذا الکتاب	کی جس میں شواہد و زوائد حذف
محذوف الشواھد ومطروح	کر دیے گئے ہیں..... میں نے مذکورہ
الزوائد..... ولخصت کل	کتاب کے تیس حصوں کی ایک حصہ
ثلاثین سفراً فی سفر.....	میں تلخیص کر دی،.......... اور اسکا
وسمیتہ القاموس المحیط	نام القاموس المحیط رکھا، اس لیے کہ
لانہ البحر الاعظم[1]	وہ ایک سمندر بے پایاں ہے۔

تقی الکرمانی کا بیان ہے کہ

صنف القاموس مطولا فی	انھوں نے متعدد جلدوں میں مطول
مجلدات عدیدۃ ثم امرہ	قاموس تصنیف کی، پھر میرے والد نے
والدی باختصارہ فاختصرہ	ان کو اسکی تلخیص کا حکم دیا، چنانچہ ایک
فی مجلد ضخم وفیہ فوائد	ضخیم جلد میں انھوں نے اس کا خلاصہ
عظیمۃ وفوائد کریمۃ و	کیا، اس میں بہت ہی نوادر فوائد

[1] القاموس مطبوعہ نولکشور جلد اول ص ۲

اعتراضات علی الجوھری[1] — اور جوہری پر اعتراضات ہیں

علامہ شوکانی رقمطراز ہیں :۔

هو كتاب ليس له نظير وقد انتفع به الناس ولم يلتفتوا بعده الى غيره[2]

وہ ایک بے نظیر کتاب ہے، لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، اور اس کے بعد پھر کسی کتاب کی طرف التفات نہ کیا۔

صاحب روضات کا بیان ہے :

قد سارت الركبان بتصانيفه سيما القاموس فانه اعطى قبولاً حسناً[3]

ان کی تصانیف تمام دنیا میں پھیل گئیں، بالخصوص قاموس کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں :

هو عديم النظير ومقصود ذوى الالباب فى علم الاعراب[4]

وہ عدیم النظیر کتاب ہے، اور اہل خرد علم اعراب میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تقی الدین الفاسی بیان کرتے ہیں :

الف فى اللغة تواليف حسنة منها القاموس ولا نظير له فى كتب اللغة لكثرة ما حواه من الزيادات على الكتب المعتمد كالصحاح[5]

انھوں نے فن لغت میں بہت اچھی کتابیں تالیف کیں، انہی میں القاموس ہے جس کی نظیر معاجم میں مفقود ہے، کیونکہ اس میں لغت کی دوسری معتبر و مستند کتابوں مثلاً صحاح وغیرہ پر بہت سے اضافے اور زیادات ہیں۔

---

[1] الضوء اللامع ۱۰، ص ۸۲ [2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۳ [3] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۸
[4] الضوء اللامع ج ۱۰، ص ۸۲ [5] ایضاً ص ۸۴

اس کا پہلا اڈیشن کلکتہ سے لیتھو میں ۱۲۳۰ھ سے ۱۲۳۲ھ تک چار حصوں میں شائع ہوا، اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۹۰۸ ہے، اس اڈیشن کے شروع میں انگریزی میں ایک مقدمہ اور عربی میں مولف کے حالات وغیرہ بھی ہیں، دوسرا اڈیشن ٹائپ میں بمبئی سے ۱۸۸۳ء میں اور پھر لکھنؤ سے ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا، مصر میں جزو دوم کا پہلا اڈیشن ۱۲۷۲ھ میں چھپا، جس کی ابتدا میں چار صفحات شیخ نصر الهورینی کی معرفة اصطلاح القاموس کے بھی ہیں، جزو چہارم مطبعہ بحریہ قسطنطنیہ سے بھی ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوا، جو ۲ ۵۱۹ صفحات پر مشتمل ہے، القاموس کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہوا جو قسطنطنیہ سے ۱۲۳۰ھ میں در بولاق مصر سے ۱۲۵۰ھ میں شائع ہوا۔[1]

خصوصیات و نقائص

القاموس کی شہرت و مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج بھی جبکہ عربی معاجم میں گرانقدر اضافہ ہو چکا ہے، اسے مستند ترین لغت شمار کیا جاتا ہے۔

اس سے قبل امام جوہری (المتوفی ۳۹۳ھ) کی شہرۂ آفاق الصحاح فی اللغة کا سکہ دنیائے علم میں رواں تھا، لیکن علامہ فیروز آبادی نے القاموس کے ذریعہ اسکو ختم کر دیا، انھوں نے صحاح کی طرف لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی توجہ کو بجا قرار دیتے ہوئے اسکی تعریف کی ہے، لیکن اس کے نقائص اور فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، خود فیروز آبادی کے الفاظ میں صحاح جوہری کی خامیاں یہ ہیں: "انه فاته نصف اللغة او اكثر اما باهمال المادة او بترك المعانى الغريبة المادة"

جوہری نے جہاں کہیں جادۂ صواب سے انحراف کیا ہے، فیروز آبادی نے اس کو شواہد سے واضح کیا اور اس پر تنبہ دلایا ہے، اس کے باوجود علمی بحثوں اور ان پر اعتراضات

---

[1] معجم المطبوعات ج ۲ ک ۱۴۷۱

میں کتاب کو جوہری پر طعن وطنز سے داغدار نہیں ہونے دیا ہے، لغت کی دوسری کتابوں میں صحاح جوہری کے نقد کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنے کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں،

اختصصت کتاب الجوهری	میں نے لغت کی دوسری کتابوں میں
من بین الکتب اللغویة مع	صحاح کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس میں
ما فی غالبها من الاوهام	بہت سے واضح اوہام ہیں اور اسکے
الواضحة لتداوله واشتهاره	نصوص ونقول پر مدرسین کو بڑا اعتماد
بخصوصه واعتماد المدرسین	ہے، اور وہ بہت متداول ومشہور
علی نقوله ونصوصه[1]	ہے،

القاموس میں صحاح پر اضافے اور زیادات اس قدر کثرت سے ہیں کہ اگر انھیں علیحدہ کیا جائے تو صحاح جیسی ضخیم ایک جلد تیار ہو سکتی ہے،[2] اس کی عبارت کی روانی وصفائی اور اسلوب کی شگفتگی ودل آویزی فیروزآبادی کے اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت ہے۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں

کتاب القاموس للامام مجد الدین	امام مجد الدین الشیرازی کی کتاب
الشیرازی اجل ما الف فی	القاموس فن لغت کی کتابوں میں
هذا الفن لاشتماله علی کل	بہت اہم کتاب ہے، اس میں فصیح و
مستحسن من قصاری فصاحة	بلیغ عربی زبان کی تمام خوبیاں موجود
العرب العرباء[3]	ہیں۔

ان خصوصیات ومحاسن کے باوجود اس کتاب کو بشری خامیوں سے بالکل مبرا

[1] القاموس ص ۲ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۳ [3] تاج العروس ج ۱ ص ۲

نہیں قرار دیا جا سکتا، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ میں نے القاموس کے مطالعہ کے دوران میں اس کی بہت سی فروگذاشتوں اور نقائص کو محسوس کیا، اور ان کو تتمہ کے طور پر ایک مستقل جلد میں یکجا کرنے کا ارادہ کیا، قاضی ادریس بن محمد المعروف بوسیلی (۱۰۳۲ھ) نے جوہری پر فیروزآبادی کے اعتراضات کے جوابات مرج البحرین کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیے ہیں، شیخ داؤد زادہ (المتوفی ۱۰۱۷ھ) نے بھی در اللقیط فی اغلاط القاموس المحیط کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں بھی صحاح پر کیے گئے اعتراضات پر بحث اور کچھ اضافہ ہے[1]

حافظ سخاوی فرماتے ہیں:

تعرض فیه لاکثر الفاظ الحدیث	اس میں مصنف نے حدیث وروایت
والروایة ووقع له خطأ	کے اکثر الفاظ سے تعرض کیا ہے، لیکن بہت سے
فی ضبط کثیر من الرواة[2]	رواۃ کے ضبط میں اس سے غلطی ہو گئی ہے

تقی الفاسی ذیل التقیید میں لکھتے ہیں:

"علامہ فیروزآبادی نے حدیث میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے اسانید ورواۃ کے سلسلہ میں بہت جگہ لغزشیں کی ہیں"[3]

القاموس کا سب سے مستند نسخہ القاموس ۱۳۸۱ھ میں لکھی گئی، اس کا مستند ترین نسخہ وہ ہے جس کی قرأت فیروزآبادی کے سامنے سب سے آخر میں ہوئی، وہ بہت سے ایسے اضافوں اور ترمیمات پر مشتمل ہے، جن سے دوسرے نسخے خالی ہیں، اس کے آخری نسخہ کو علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے اس نسخہ سے بھی بہتر قرار دیا جاتا ہے، جو چار جلدوں میں مدرسہ باسطیہ مصر

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۴ [2] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ [3] ایضاً

میں محفوظ ہے۔[۱]

شروح وحواشی القاموس کی بکثرت شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس ہے، جو دس جلدوں میں ہے، قاموس کا خطبۂ افتتاحیہ اپنی جامعیت اور معنویت میں ضرب المثل ہے، اس لیے بہت سے علماء نے اس کی بھی شرحیں لکھی ہیں، ان میں محب بن شحنہ، قاضی ابی روح عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی اور مرزا علی شیرازی کی شرحیں لائق ذکر ہیں،

اس کے علاوہ پوری کتاب کی شرحوں میں سیوطی کی الافصاح فی زوائد القاموس علی الصحاح، عبدالباسط بن خلیل (م ۹۲۰ھ) کی القول المانوس بشرح مغلق القاموس، علی بن غانم المقدسی (م ۱۰۰۴ھ) کے حواشی، شیخ ابراہیم حلبی (م ۹۵۶ھ) کی تلخیص القاموس، عبداللہ بن شرف الدین الحسنی (م ۹۷۳ھ) کی کسر الناموس، محمد بن یحییٰ القراتی کی بہجۃ النفوس فی المحاکمۃ بین الصحاح والقاموس، امام محمد بن الطیب الفاسی (م ۱۱۷۰ھ) اور برہان الحلبی کی تلخیص قاموس ممتاز و نمایاں ہیں۔[۲]

تاج العروس علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اپنی شہرۂ آفاق شرح تاج العروس من شرح جواہر القاموس کے نام سے کامل ۱۴ سال کی محنت شاقہ کے بعد تصنیف کی تھی، جس میں انھوں نے صحاح جوہری، لسان العرب اور شرح ابن الطیب سے کافی استفادہ کیا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۱۸۱ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی تو اس کی خوشی میں غیط المعدیہ میں ایک شاندار دعوت دی، جس میں مشاہیر شیوخ اور علماء و فضلاء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس مایۂ ناز تصنیف کے بعد علامہ زبیدی اپنے مکان

[۱] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۰۲ [۲] تاج العروس ج ۱ ص ۳

میں گوشہ گیر ہوگئے تھے، یہاں تک کہ ۱۲۰۵ھ میں مرض طاعون میں وفات پائی۔[۱]

تاج العروس کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۶ھ میں مطبع وہبیہ مصر سے شائع ہوا، مگر اس کی صرف پانچ ہی جلدیں اس وقت طبع ہو سکیں، پھر ۱۳۰۶ھ میں مطبعہ خیریہ مصر نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا، اور کامل دس جلدوں میں نہایت اہتمام سے اس کو شائع کیا، یہی اڈیشن اب عام و متداول ہے، اس کے شروع میں دس ابواب پر مشتمل علامہ زبیدی کا ایک نہایت مفید مبسوط مقدمہ ہے، جس میں فن لغت، لغویین اور انکے طبقات اور فیروزآبادی کے سوانح حیات وغیرہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲- **منح الباری بالسیح الفسیح الجاری**۔ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ اسے مصنف چالیس جلدوں میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن صرف بیس ہی جلدیں لکھی جاسکیں اور وہ بھی باب العبادات کے چوتھائی تک ہے، اور اب معدوم ہے،[۲] مگر بقول تقی الفاسی علامہ فیروزآبادی کو حدیث اور اس کے متعلقات میں پوری مہارت نہ تھی، اس لیے وہ منح الباری میں شرح کا پورا حق ادا نہ کرسکے، حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

اما شرحہ علی البخاری فقد ملأہ بغرائب المنقولات[۳]	انھوں نے اپنی شرح بخاری کو عجیب غریب باتوں سے بھردیا ہے

حافظ ابن حجر عسقلانی نے جنھیں فیروزآبادی سے خاص تلمذ حاصل تھا، بخاری کی مشہور عالم شرح فتح الباری کے نام سے لکھی، صاحب روضات کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ نام اپنے شیخ کی منح الباری سے اخذ کیا ہے،

اخذ من اسم شرح الفیروزآبادی علی الصحیح المذکور[۴]	ابن حجر نے یہ نام فیروزآبادی کی شرح بخاری سے اخذ کیا ہے۔

[۱] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۳۱، [۲] الخطط الجدیدۃ ج ۳ ص ۹۵ [۳] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ [۴] روضات الجنات ج ۴ ص ۹۴

لیکن علامہ قسطلانی نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مجد الدین سمی شرح الحافظ منح	مجد الدین نے حافظ کی شرح کا نام ف کے بجائے
الباری بالمیم بدل الفاء وان	میم سے منح الباری رکھا تھا جب ابن حجر کو
الحافظ اطلع علیہ ولم یرتضہ	یہ معلوم ہوا تو اس نام کی کثرت نقل کی وجہ سے
لکثرۃ نقلہ عن ابن عربی[1]	انھوں نے اس کو پسند نہ کیا۔

فیروز آبادی کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی ہیں ان میں القاموس کے علاوہ تحبیر الموشین فی التعبیر بالسین و الشین، تنویر المقیاس من تفسیر سیدی عبد اللہ ابن عباس، اور سفر السعادۃ کے نام ملتے ہیں، اول الذکر ۱۳۲۷ھ میں مطبعہ ثعالبیہ جزائر اور ۱۳۳۰ھ میں مطبعہ الہیہ بیروت سے طبع ہوئی۔[2]

خاتمہ کلام راقم سطور نے اس مقالہ کے پہلے نمبر میں عرض کیا تھا کہ آٹھویں صدی ہجری کا زمانہ پوری اسلامی تاریخ کا اس حیثیت سے بڑا تابناک ہے کہ مختلف علوم کی جس قدر ترقی و اشاعت اور ماہرین فضلاء کی کثرت اس زمانہ میں رہی اس کی نظیر کسی دوسری صدی میں نہ مل سکے گی، صرف نویں صدی کو کسی حد تک اس کے مقابلہ پر پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اس عہد کے اوائل کے جتنے باکمال اہل علم گذرے وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ آٹھویں صدی ہی کی بہار کے پروردہ تھے، مذکورہ بالا جائزہ سے مقصود اسی عہد زریں کی علمی چہل پہل کی صرف ایک جھلک دکھانا تھا، ورنہ اسکی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

---

[1] ارشاد الساری ج ۱ ص ۹۴ [2] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۷۰

ایک ضروری استدراک

مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے ملا نظام الدین پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ایک سلسلہ میں لکھا ہے کہ "یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ" کے ورد کے جواز و عدم جواز کے بارہ میں علماء میں اختلاف رائے ہے، بعض علماء اس ورد کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں، کوئی سو سال پہلے اس سلسلہ میں ایک صاحب نے جن علماء سے استفتاء کیا تھا، اُن میں مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی بھی تھے، انھوں نے کلیۃً اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے، ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، کتاب کا نام ہے "فتویٰ جواز یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ"، مولانا اشرف علی صاحب نے بھی اسکی اجازت دی ہے، انکی تحریری اجازت مولانا حکیم واثق الیقین صاحب سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی حفید ملا نظام الدین کے پاس موجود ہے، مولانا سید ابو الحسن ندوی اس اجمال کی تفصیل یہ تحریر کی ہے:

"میں نے فتاویٰ رشیدیہ و امداد یہ دونوں سے مراجعت کی حضرت گنگوہی تو عدم جواز کے قائل ہیں، اور مولانا تھانوی بعض شرائط و قیود کے ساتھ اجازت دیتے ہیں اور خواص کیلئے جائز سمجھتے ہیں، فتاویٰ رشیدیہ میں جو حضرت مولانا رشید احمد کے فتاویٰ کا زیادہ مستند مجموعہ اور انکے صحیح اور آخری مسلک کا ترجمان ہے، اسکے خلاف فتویٰ موجود ہے، اس کے مطابق وہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور مولانا تھانوی صرف خواص اہل علم کے لیے اس کی اجازت دیتے ہیں۔

وفیات

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ دو ممتاز اہل علم نے وفات پائی، حکیم حافظ خواجہ شمس الدین صاحب لکھنوی اور سید اختر علی صاحب تلہری، حکیم صاحب تنہا حاذق طبیب ہی نہیں تھے، بلکہ عربی زبان اور اسلامی علوم کے فاضل بھی تھے، اور شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، طب یونانی کے تو ماہر ہی تھے، اور اب لکھنؤ میں اسکی عظمت انہی کے دم سے قائم تھی، طب کی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، جن کے پڑھانے والے اب کم رہ گئے ہیں، آداب اخلاق میں لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور وضعداری کا نمونہ تھے، لکھنؤ کے متعدد قومی ملی اداروں کے رکن تھے اور انکے کاموں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ندوہ سے خاص تعلق تھا، اور اسکی مجلس منتظمہ کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے، مولانا عبد الباری فرنگی محل کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، اس تعلق سے ان سے بہت پرانی شناسائی تھی آخر میں تصوف کیطرف زیادہ رجحان ہو گیا تھا، اب طب یونانی کے ماہر اٹھتے جا رہے ہیں، طبی درسگاہوں سے طبیب کے بجائے ڈاکٹر پیدا ہونے لگے ہیں اور خالص فن طب ختم ہوتا جاتا ہے، مرحوم لکھنؤ میں اسکی آخری یادگار تھے، انکی موت سے فن طب اور پرانی تہذیب شرافت کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

سید اختر علی صاحب تلہری

سید اختر علی صاحب صاحب فن شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھے، اردو اور فارسی زبان و ادب پر استادانہ نظر تھی، عربی اور انگریزی سے بھی واقف تھے، ساری عمر درس تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، انکے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، انکی تربیت نے بہت سے شاعر و ادیب پیدا کر دیے، انکا کلام اور مضامین رسالوں میں نکلتے رہتے تھے، معارف میں بھی انکی غزلیں شائع ہوتی تھیں، عرصہ ہوا معارف میں ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک مبسوط مضمون شائع ہوا تھا، اتفاق سے اس میں کسی شیعہ شاعر کا ذکر نہ تھا، تلہری صاحب نے مجھکو شکایت کا خط لکھا، میں نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے مضمون جس شکل میں آیا تھا میں نے شائع کر دیا، اگر آپ شیعہ شعراء پر لکھ بھیجیں تو اسکو بھی شائع کر دیا جائیگا، چنانچہ یہ مضمون انھوں نے لکھکر بھیجا اور وہ شائع ہوا، مضامین کے علاوہ مستقل علمی و ادبی تصانیف بھی انکی یادگار ہیں، آجکل شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہیں، انکی تعداد روز افزوں ہے، اس سے نظم و نثر دونوں کا دامن بہت وسیع ہو گیا ہے لیکن فنی مہارت اور علمی و ادبی بصیرت مفقود ہوتی جاتی ہے، تلہری مرحوم کی وفات سے ایک صاحب علم و ادب اور صاحب فن شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

فکرِ جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں
ہے عالمِ سرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

یارائے ضبطِ شدتِ جذبات اب نہیں
اے طبعِ ناصبور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہو رفعتِ خیال کا ہر شعر آئینہ
اے فطرتِ غیور، غزل کہہ رہا ہوں میں

کاشانۂ خلوص میں جلتی ہے شمعِ دل
روشن ہے لاشعور، غزل کہہ رہا ہوں میں

سنتے ہیں سر جھکائے ہوئے ساکنانِ عرش
یہ کس نشہ میں چور، غزل کہہ رہا ہوں میں

کرنا ہے نذرِ ساقیِ کوثر ہر ایک شعر
پی کر مئے طہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

کہتا ہوں شعر مہرِ رسالت کی شان میں
ہے نور کا وفور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل میں خیالِ گنبدِ خضرا لیے ہوئے
فکرِ جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

بوئے گلِ ولائے نبی ہے مشامِ جاں
بکھری ہے زلفِ حور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ماہِ عرب کا دل میں تصور ہے ہر گھڑی
پھیلا ہوا ہے نور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے کہاں دماغ کہاں یہ نہ پوچھیے
کہنے کو ہاں ضرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے ترے دیار میں اے سرورِ جہاں
گو تجھ سے رہ کے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہر شے میں دیکھتا ہوں جھلک تیرے نور کی
جلووں کا ہے ظہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ملتا ہے فیضِ صحبتِ روح القدس ولیؔ
روشن ہے شمعِ طور، غزل کہہ رہا ہوں میں

نعتِ مبارک

از

جناب محوی صاحب صدیقی لکھنوی

یہ بھی عجب کمالِ محبت دکھا دیا — تم کو خدا نے جانِ دو عالم بنا دیا

اس بارشِ کرم پہ ہو انسانیت کو ناز — انسانیت کی رُوح کو پھر سے جگا دیا

اسرارِ کائنات کو سمجھے کچھ آپ ہی — قانون کو بھی جانِ شریعت بنا دیا

دینِ خدائے پاک پہ چھائی تھی مردنی — کشتِ اجل رسید کو پھر لہلہا دیا

حیرت میں ہو زمانہ کہ چھ سات سال میں — بچھڑے ہوئے دلوں کو خدا سے ملا دیا

آئے جو یاد عظمت ماضی تو کیا کروں — اس نے تو اور جان و جگر کو گھلا دیا

دونوں جہاں کی نعمتیں اس نے تو دیں ہمیں — اب یہ بتاؤ ہم نے محمد کو کیا دیا

ہر ہر گلی مدینے کی ہو نازشِ بہار — ہر ہر قدم پہ ایک نیا گل کھلا دیا

فرعونِ وقت نذرِ جہنم ہوئے تمام — بو جہل و بو لہب کو بھی نیچا دکھا دیا

نازاں حریم کعبہ تو حیراں تھا ہر صنم — پھر بتکدے کو گلکدۂ دیں بنا دیا

یہ کیف یہ سرور یہ مستی یہ سرخوشی — کیا اہلِ حق کو بادۂ عرفاں پلا دیا

اچھا ہوا کہ مل گئی کچھ رخصتِ سخن
محوی نے آپ ہی کا فسانہ سنا دیا

نعت

از

جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری

نگاہوں میں سمایا ہے مدینہ کا دیار اب تک — نظر کے سامنے ہے سبز گنبد کی بہار اب تک

زمانہ ہو گیا دنیا میں وہ تشریف لائے تھے — برستی ہے جہاں میں رحمتِ پروردگار اب تک

وہ جنت کا سماں وہ گنبدِ خضریٰ کی تابانی — نظر میں رقص کرتے ہیں وہی لیل و نہار اب تک

غبارِ کارواں دشتِ طیبہ یاد ہے مجھکو — بڑھاتے ہیں جنونِ عشق، وہ گرد و غبار اب تک

شریعت تیری اے ہادیٔ اعظم عین فطرت ہے — وہ اندھے ہیں جنھیں آتا نہیں ہے اعتبار اب تک

مدینہ کے در و دیوار پہ رحمت برستی ہے — چلی آتی ہے رحمت کے فرشتوں کی قطار اب تک

سنوارا باغباں نے اس طرح گلشن مدینے کا — ہے اپنے حال پر قائم گلستاں کا نکھار اب تک

ابھی تک یاد ہیں وہ مثلِ گل کانٹے مدینے کے — مزہ دیتے ہیں تلوؤں کو مرے وہ نوکِ خار اب تک

تری ذاتِ منور سے درخشاں ہے جہاں سارا — ترے جلوے سے خورشید و قمر ہیں شرمسار اب تک

تمام اہلِ خرد طفلِ دبستاں ہیں ترے آگے — ہے ناممکن تمہارے اوصافِ عالی کا شمار اب تک

نگاہِ لطف اب عثمان کیجانب بھی ہو جائے
جدائی میں وہ روتا جا رہا ہے زار زار اب تک

باب التقریظ والانتقاد

سلاطین دہلی کے عہد کے امرا

(۱۲۰۶ء ۔ ۱۳۹۸ء)

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ انگریزی کتاب جناب ایس ، بی ، پی نگم صاحب پی ، ایچ ، ڈی کی تصنیف ہے، فاضل مؤلف اودے پور یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرار ہیں، کتاب کا حجم اشاریہ اور کتابیات ملاکر ۲۲۳ صفحے پر مشتمل ہے، یہ غالباً پی ، ایچ ، ڈی کا مقالہ ہے، اس میں حسب ذیل ابواب ہیں،

(۱) تمہید (۲) البا ری امرا سلطان گر (۳) خلجیوں کے عہد میں امارت کا ارتقا، (۴) تغلق کے عہد میں امارت کا ارتقا، (۵) ترک امراء کی نوعیت (۶) امارت کی تنظیم (۷) امراء، علماء اور سلاطین (۸) امراء کی ملازمت کے شرائط، مراعات اور نظام تربیت (۹) تتمہ، ان کے علاوہ کچھ ضمیمہ جات ہیں،

لائق مصنف فارسی بھی جانتے ہیں اس لیے فارسی کے معاصر ماخذوں سے پورا استفادہ کیا ہے،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر اب جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو پڑھتے وقت

یہ خیال رہتا ہے کہ اس کے لکھنے میں صرف تحقیق اور تلاش مدنظر ہے، یا تحقیق و تلاش کی آڑ میں کسی خاص مقصد کی تکمیل کی جا رہی ہے، انگریزوں نے اپنے زمانہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی جو تاریخ لکھی تو ان کی تحقیقات میں ان کے سیاسی مصالح غالب رہے، لیکن اسی زمانہ میں بعض مورخوں مثلاً ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی، ڈاکٹر پی، ان، اسرن، پروفیسر رام پرشاد کھوسلا وغیرہ نے جو تاریخیں لکھیں، ان میں سیاسی مصالح کے بجائے مصالحانہ انداز بیان تھا، جو آج بھی جذباتی یگانگت پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ مورخین کا وہ انداز نہیں رہا جو ان مورخوں کا تھا، ان کی تاریخوں میں تحقیق کے پردے میں دل آزار اور تکلیف دہ باتیں کہی جانے لگی ہیں،

زیر نظر کتاب کے مولف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ان کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور خالص مورخانہ ہو، ان کی کتاب سے اس عہد کے امراء کے کارناموں کا ایک واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، اس زمانہ میں سلاطین سے زیادہ اہم امراء ہی تھے، اور وہ اپنی خواہش کے مطابق جس طرح سلاطین کو تخت پر بٹھاتے اور معزول کرتے رہے، اس لحاظ سے تو اس زمانہ کی بادشاہت دستوری بادشاہت معلوم ہوتی تھی، جیسا کہ مولف نے بھی اپنی اس کتاب میں اعتراف کیا ہے،

ان امرا کے کارناموں کا باضابطہ جائزہ تو ضمنی حیثیت سے مختلف کتابوں کے متفرق ابواب یا اوراق میں لیا گیا تھا، مگر نگم صاحب نے یہ جائزہ ایک کتاب میں لے کر ایک کمی کو پورا کردیا ہے، اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوگیا ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں لائق مولف کی رائے کھٹکی، مثلاً وہ لکھتے ہیں :

"علما ..... ہمیشہ یہ آواز بلند کرتے رہے کہ موت یا اسلام، یہ مسلمانوں کی لڑنے والی جماعت کی ہمت کو بلند کرنے کے لیے ایک مقبول نعرہ رہا، علما سلاطین کو یہ مشورہ دینے میں بالکل نہیں تھکتے۔ اگر اس قسم کی باتیں جنگ کے زمانے میں کہی جاتیں تو ان کو محض ایک پروپگنڈا کی حیثیت دیکھ کر نظر انداز کر دیا جا سکتا تھا، لیکن المیہ تو یہ ہے کہ علما نے اس قسم کی تجویزیں امن کے زمانے میں بھی پیش کیں، مورخ کا متشککانہ ذہن قدرتی طور پر یہ پکار اٹھتا ہے کہ کیا یہی اسلام ہے؟" (تمہید، ص ۱۰)

مؤلف نے اسی قسم کی باتیں کئی اور جگہ (ص ۱۲۲ ۔ ص ۱۳۱) بھی لکھی ہیں اور حوالہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ کا دیا ہے۔ گرچہ ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ انتہا پسندانہ خیال صرف برنی کے ذہن کی پیداوار ہے (ص ۱۳۱)۔ اگر وہ اس کو واقعی بعض علماء کا انتہا پسندانہ خیال سمجھتے تو پھر اوپر کی عبارت لکھ کر اسلام پر حرف گیری کر کے اپنے متشککانہ ذہن کا اظہار نہ کرتے، گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر معلوم نہیں کتنی بار ایسی رائے کی تردید کی جا چکی ہے، مولانا شبلی نے الفاروق، پھر اپنے مضمون الجزیہ اور حقوق الذمیین میں بھی اس پر مدلل بحث کی ہے، اگر مولف کی نظر ایسے لٹریچر پر بھی ہوتی تو اس قسم کی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتے، اس سے قطع نظر اگر یہ مذہبی مسئلہ ہے تو پھر اس پر بحث کلام پاک، حدیث اور خلفائے راشدین کے عمل کی روشنی میں کی جانی چاہئے تھی، کسی ایک یا دو عالم کا حوالہ دے کر اس کو اسلام کی تعلیم نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، اور اگر یہ تاریخی بحث ہے تو پھر مولف کو بھی اس کا اندازہ ہے کہ اس پر عمل کبھی نہیں ہوا، بعض مورخین اپنے فاتحانہ پندار میں کچھ ایسی باتیں ضرور لکھ گئے ہیں جن سے بے جا فائدہ اٹھا کر ذہن کو مسموم کیا جا سکتا ہے، لیکن خود مولف کو اعتراف ہے کہ

"ایسے ہندو امرا کی تعداد بھی بہت ہے جو شاہی دربار کے معاون تھے اور یہاں برابر حاضر ہوتے رہے، اگرچہ ان کے سیاسی کارنامے نظر انداز کیے جانے کے لائق ہیں، رائے دنوج نے لکھنوتی کے مقطع طغرل کو گرفتار کرنے میں بلبن کو مدد پہنچائی، بلبن رائے دنوج سے اپنے دربار میں عزت سے پیش آیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہندو معاون راجاؤں کو امن سے رہنے دیتا تھا، گرچہ یہ ہندو راجہ دربار یا اس زمانہ کی سیاست میں زیادہ اثر نہ رکھتے تھے، سلطان معز الدین کیقباد کے زمانہ میں بھی رایوں اور راجاؤں کی تعداد زیادہ تھی، معز الدین کی وفات کے بعد جب سلطان جلال الدین نے کڑہ کے ملک چھجو کے خلاف فوج بھیجی تو رائے برم دیو کوتلہ اور رائے بھیم دیو نے موخر الذکر کی اس لیے مدد کی کہ وہ بلبن کے خاندان کے وفادار تھے (ص ۱۰۸)

اوپر کی عبارت میں ہندو امرا کے سیاسی کارنامے نظر انداز کیے جانے کے لائق بتائے گئے ہیں، یہ اسلیے کہ ان کے کارناموں کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا، لیکن میرا خیال ہے کہ آگے چل کر جب زیادہ معلومات فراہم ہونگی تو سلاطین دہلی کے دربار کے ہندو راجاؤں کے اثرات نظر انداز کیے جانے کے لائق نہ سمجھے جائیں گے، اب بھی تاریخوں میں کچھ ایسے مواد ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو راجہ دربار میں اثر انداز ہوتے رہے، مثلاً علاء الدین خلجی کے زمانہ میں دیوگیر کے راجہ رام دیو کا ذکر معاصر مورخین بہت احترام سے کرتے ہیں، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کے لیے "سرفراز ہنود"، "بندۂ خاص درگاہ شاہ" جیسے فقرے لکھے ہیں، اور رقمطراز ہے کہ جب وہ علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس پر موتی نچھاور کیے گئے، دو لاکھ تنکے نذر دیے گئے اور رائے رایان کا خطاب دیا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کو چتر بھی عطا ہوا (فتوح السلاطین ص ۲۷۴ - ۷۶)۔ خود رام دیو نے جنوبی ہند کی تسخیر میں علاء الدین خلجی کی فوج کو ہر قسم کی مدد پہنچائی، ضیاء الدین برنی اس کی اطاعت، فرمانبرداری اور ہوا خواہی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"دانایان و تجربہ یافتگان لشکر اطاعت و فرمانبرداری و اخلاص و ہوا خواہی رام دیو مشاہدہ می کردند و می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بسرکاری کردن ہمیں بار آورد کہ از رام دیو معاینہ می شود" (ص ۳۲۶)

امیر خسرو نے اس کو رائے نیک اصل لکھا ہے۔ (خزائن الفتوح ص ۳۸)

امیر خسرو ہی کا بیان ہو کر اسکی وجہ سے ہندو اور مسلمان میں بڑی یگانگت پیدا ہو گئی تھی، اس طرح کہ

زترکے کرد بر ہندو جفائے ز ہندو را مخالف بود رائے

عصامی کے بیان کے مطابق تو سلطان قطب الدین خلجی رام دیو کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ (ص ۳۳۵ - ۳۴۴)

جب علاء الدین خلجی کی فوج معبر کی طرف بڑھی تو دھور سمندر کے راجہ ویر پانڈیا (بلال) نے بڑی اعانت پہنچائی، عصامی اسکو "فخر دایان ہندوستان"، "یار لشکر ملک کافور"، "فخر ہندوستان" کہتا ہے، اور پھر بڑے جوش و خروش سے معبر کی فتح میں اس کی فوجی اعانت کا ذکر کرتا ہے:

پس از ہفتہ گفتش آں کامران (ملک کافور) کہ اے فخر دایان ہندوستان

تو چوں از دل و جان شدی یار ما دل و جان تو باد عشرت گرا

کنوں بشنو اے فخر ہندوستان چنین است فرمان شاہ جہان

کہ ایں بار ہمراہ لشکر شوی زنی کوس و در سمت معبر شوی

کہ آگہ نگردد کس از اہل راہ کشد ناگاہ سر بر معبر سپاہ

بہ سمع بلال ایں سخن چوں رسید گریزے دگر جز اطاعت پذیر

پذیرفت فرمان شاہ جہان پے رہبری بست محکم میان

اس قسم کے تعاون و یگانگت کے واقعات بہت کچھ مل سکتے ہیں، تاریخ کے واقعات کی حیثیت کچے مواد کی ہوتی ہے، ان سے دلوں کو توڑے جاسکتے ہیں تو جوڑے بھی جاسکتے ہیں، ہندوستان کی فلاح و بہبود کی خاطر ہندوستان کے موجودہ دور کے مورخوں کو یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ گذشتہ زمانے میں جو کچھ ہوا اسکی تلافی اب نہیں ہو سکتی ہے، ان پر زہریلے تبصرے کر کے دلوں کو تو ضرور توڑے جاسکتے ہیں، لیکن ہندوستان کو اسوقت دلوں کو توڑنے کے بجائے دلوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے، ایک مورخ اس کام کو اپنے قلم کے ذریعہ سے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے۔

زیر نظر تصنیف منشی رام منوہر لال "تاجر کتب" نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، قیمت پچیس ۲۵ روپے ہے، لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔

"ع، ب"

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر اسلام ۔ مترجمہ مولانا وارث علی ایم اے فاضل دیوبند، تقطیع بڑی، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰۴، مجلد قیمت دس روپے (عہ)

پتہ:۔ نمبر ۱۳ زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۱۔

زیر نظر کتاب ایک یورپین عالم کونسٹان ورزیل جارج کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، مصنف کا وطن رومانیہ ہے، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد انھوں نے فرانس میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں یہ کتاب لکھی، اس کی تصنیف کے بعد وہ حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے، یہ کتاب بڑی محنت اور بائیس سال کے مطالعہ و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے، مصنف یورپین ہیں، اس لیے انھوں نے واقعات کے اسباب اور عقلی توجیہات بھی بیان کی ہیں مگر بعض توجیہات صحیح نہیں ہیں، بعض واقعات و حالات بہت مفصل تحریر کیے ہیں لیکن ... بعض غیر مستند واقعات بھی درج کر دیے ہیں جو سیرت کی مشہور و متداول کتابوں میں نہیں ہیں، بعض صحیح واقعات میں غلط واقعات اور تفصیلات بھی شامل کر دی ہیں، لائق مترجم نے ایسے بیانات کی تردید کر دی ہے لیکن بعض غلطیوں کی تردید رہ گئی ہے، جیسے مہاجرین حبشہ کی تعداد نو سو ۹۰۰، حضرت ابو بکرؓ کا رسول اللہ صلعم سے تین سال عمر میں بڑا ہونا، ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا گھاٹی کے اندر ہی انتقال کرنا اور سراقہ بن جعشم کا نام سراقہ بن مالک وغیرہ، مترجم نے اپنی اصلاحات کو حواشی میں لکھنے کے بجائے متن ہی میں گڈمڈ کر دیا ہے، ترجمہ میں تعبیر اور زبان و بیان کی بعض خامیوں

کے علاوہ کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں، ایک جگہ حلف الفضول کے معنی "لڑنے والی فوج" اور دوسری جگہ "چھوٹی سی فوج" لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، غالباً اس کتاب کو فارسی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ بہتر ہے، اور مصنف کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور غیر جانبداری قابلِ تعریف ہے، اس کتاب سے سیرت کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہوا ہے،

تعارف مخطوطات کتبخانہ دار العلوم دیوبند } مرتبہ مولانا محمد ظہیر الدین صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۶۸ قیمت دس روپے، ناشر دار العلوم دیوبند۔ یو، پی۔

دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان کتبخانہ میں قلمی کتابوں کا بھی اچھا اور وسیع ذخیرہ ہے، اب کتبخانہ کی جدید ترتیب و تزئین کے سلسلہ میں اس کے مخطوطات و نوادر کی فہرست کی ترتیب و اشاعت کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں قرآن مجید کے قلمی نسخوں اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور ان کے متعلقہ علوم کے مخطوطات کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، لائق مرتب نے مخطوطات کے تعارف میں جہانتک ممکن ہو سکا ہے ان کے سنہ تالیف و کتابت، موضوع، سائز، ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد، کاغذ و کتابت کی حالت، اہم خصوصیت اور مصنفین و کاتبین کے ناموں کی تصریح اور ان کے سنین وفات وغیرہ تحریر کیے ہیں، اور مصنفین کے مفصل حالات کے ماخذ و ں کی نشاندھی بھی کر دی ہے، اس جلد میں تقریباً ..۵ مخطوطات کا تعارف شامل ہے، ان میں بعض نادر و کمیاب ہیں، شروع میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کتابوں کی اور آخر میں مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے دو فہرستیں دی گئی ہیں۔ فہرست محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے،

اور اس کے لیے فاضل مرتب اصحاب علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اسلام کی دعوت ۔ مرتبہ مولوی سید جلال الدین صاحب عمری تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۳۰۴ قیمت تین روپے۔ پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

اس کتاب میں اسلام کی دعوت اور اس سے متعلقہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے، پہلے انبیاء علیہم السلام کے کاموں کی غرض و نوعیت اور ان کی دعوت کے بعض مراحل کا ذکر ہے، پھر اسلام کی دعوت کی عمومیت، امت کی تبلیغی ذمہ داری، داعیانِ حق کے لیے اسلام کی مکمل اتباع کی ضرورت و اہمیت، دعوت کے اصول و آداب، اس کی کامیابی و ناکامی کے تصور اور اس کے انکار کے اسباب وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرا حصہ داعی کے ضروری اوصاف پر مشتمل ہے، آخر میں دعوت کے لیے تنظیم و تشکیل جماعت کی ضرورت بیان کی گئی ہے، مصنف جماعت اسلامی کے رکن رکین ہیں، اس لیے انھوں نے اسلام کی دعوت کے سلسلہ میں اس کے سیاسی غلبہ و حکمرانی کے پہلو کو زیادہ نمایاں طور سے پیش کیا ہے، زبان سادہ و سلیس اور طرزِ بیان شگفتہ ہے،

کینسر وارڈ ۔ مترجمہ جناب گوپال متل صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۵۸ قیمت تین روپئے۔ پتہ نیشنل اکاڈمی ۔ ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

یہ مشہور روسی ادیب الیگزنڈر سولزنسٹین کے اس نئے اور شاہکار ناول کا اردو ترجمہ ہے، جس پر ان کو ۱۹۷۰ء کا نوبل پرائز ملا ہے، اس سے کمیونزم کا اصلی مرقع، کمیونسٹوں کے صحیح خط و خال اور ان کے ظلم و تشدد اور فکری، ذہنی اور اخلاقی پستی کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں ادیبوں اور اہل قلم کے افکار و خیالات پر ہر قسم کی پابندی عائد کر دینے اور مذہبی و اخلاقی قدروں کو جبریہ پامال

کرنے کے باوجود نہ تو انسان کی 'فطری آواز' کو دبایا جا سکا ہے، اور نہ مذہبی و اخلاقی رجحان کو معدوم کیا جا سکا ہے، یہ ناول مصنف کے گہرے فکر و شعور اور خلوص و دردمندی کا نتیجہ ہے، اردو کے مشہور ادیب و صحافی جناب گوپال متل نے اس کا ایسا رواں اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ کمیونزم اور روسی زندگی سے واقفیت کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری اور نہایت مفید ہے۔

سفرِ حج ۔ مرتبہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۵۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپے، پتہ مکتبۂ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ۔

بستی کے نامور ایڈوکیٹ اور دینی تعلیمی تحریک کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے ۱۹۶۸ء میں بیت اللہ کا حج کیا تھا، یہ کتاب اس کا سفرنامہ ہے، جو سفر کے حالات، حرمین کے تاریخی آثار و مشاہد اور حج و عمرہ کے ارکان و مناسک و اس قبیل کے ان تمام معلومات پر مشتمل ہے جو عموماً حج کے سفرناموں میں ہوتے ہیں، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے حاجیوں کو پیش آتی ہیں، اس سلسلہ میں حکومت کے نظم و نسق کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کو مفید مشورے دیے گئے ہیں، قاضی صاحب مشاق اہل قلم ہیں، یہ سفرنامہ انکے شگفتہ اور دلآویز طرزِ تحریر کا نمونہ ہے، مقاماتِ مقدسہ کے حالات، مرکز ایمان اور مہبط وحی کے مشاہدات اور قاضی صاحب کے واردات و تاثرات

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

کا مصداق ہے، جو لوگ حج و زیارت کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیے

"ض"

جلد ۱۰۷ ۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۱ء ۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات